معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہار مارکیٹ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۷ ماہ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۶ء عدد ۳

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

مضمون	مصنف	صفحات
فیصل ایوارڈ یافتہ علامہ محمود شاکر کی "حیاۃ المتنبی من شعرہ" کی اہمیت	پروفیسر محمد راشد ندوی	۱۶۵-۱۸۰
اقبال کے تصور زمان پر اعتراضات کے جواب	جناب طارق مجاہد جہلمی	۱۸۱-۲۰۱
مولانا شبلی کے خطوط - تدوین جدید کی ضرورت	ڈاکٹر شمس بدایونی	۲۰۲-۲۱۴
اخبار علمیہ	ک۔ص اصلاحی	۲۱۵-۲۱۷

معارف کی ڈاک

مضمون	مصنف	صفحات
معارف کے سائنسی مقالات	جناب ابرار اعظمی صاحب	۲۱۸-۲۱۹
خریطۂ جواہر	جناب وارث ریاضی صاحب	۲۱۹-۲۲۱
متحدہ قومیت اور املا کے بعض مباحث	جناب وارث ریاضی صاحب	۲۲۱-۲۲۴
مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات	جناب شاہد عمادی صاحب	۲۲۵

وفیات

مضمون	مصنف	صفحات
مولانا سید اسعد مدنی	"ض"	۲۲۶-۲۳۰

آثار علمیہ و تاریخیہ

مضمون	مصنف	صفحات
مکتوب گرامی ملک عبد العزیز بنام	مولانا سید سلیمان ندوی	۲۳۱-۲۳۴
علامہ سید سلیمان ندوی کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب مرحوم	۲۳۵
مطبوعات جدیدہ	ع۔ص	۲۳۶-۲۴۰

ای میل: email:shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے مسلمانوں کی بے چینی اور تڑپ کا اندازہ اخباروں سے تو ہوتا ہی ہے، ۱۲؍فروری کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے جلسے میں بھی یہی منظر دیکھنے میں آیا، چانسلر، وائس چانسلر، اساتذہ وطلبہ کے نمائندے، ماہرین قانون، سیاسی جماعتوں کے رہنما، ملی اداروں کے سربراہ، علما اور دانش ور سب ہی فکر مند اور بے قرار تھے کہ یونی ورسٹی کا اقلیتی اور تاریخی کردار کیسے بحال ہو، بالاتفاق طے پایا کہ فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جائے اور حکومت پر زور دیا جائے کہ وہ اقلیتی کردار کی بحالی کے لیے جلد کارروائی کرے، اس کی طرف پارلیمنٹ کے ممبروں کی توجہ مبذول کرانے اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کی تجویزیں بھی پیش کی گئیں، یونی ورسٹی سے مسلمانوں کا گہرا جذباتی تعلق ہے، اس پر ان کی قومی، ملی اور تہذیبی زندگی کی بقا کا دارومدار ہے، ان کے مطالبات آئینی، دستوری اور جمہوری ہیں، انہوں نے ہی یونی ورسٹی قائم کی اور یہ ان ہی کی ہے، اس میں مداخلت اور رخنہ اندازی سے ان کی بے اطمینانی اور پریشانی بڑھے گی جو ملک و حکومت کے لیے نیک فال نہیں ہے۔

مسلمانوں کی عجیب بدقسمتی ہے کہ وہ برابر مسائل اور آزمائشوں میں گھرے رہتے ہیں، ابھی ایک مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملتا کہ اس سے بڑی دوسری مصیبت سامنے آجاتی ہے، مسلم یونی ورسٹی کے لیے ان کی پریشانی اور بے تابی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں، عیسائیوں اور امریکی صدر کی ملی بھگتی سے رسول اکرم ﷺ کے اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت نے ان کو ماہی بے آب بنا دیا، افغانستان وعراق کو تباہ کر کے امریکہ کا جی نہیں بھرا تھا تو اب وہ ہاتھ دھو کے ایران کے پیچھے پڑ گیا ہے اور دنیا کا کوئی ملک اس کے ظلم وجارحیت کے خلاف آواز بلند کرنا تو درکنار سب اس کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں، ہمارا ملک تو بش کے استقبال کی تیاریاں کر رہا ہے، یاللعجب! رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخی سے سارے عالم اسلام میں ہیجان برپا ہے اور مسلمانوں کے دل چھلنی ہو گئے ہیں، کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس بدتمیزی کے خلاف احتجاج نہ ہوا ہو مگر بش کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی، آخر یہ ظلم آرائیاں کب تک؟

رام پور رضا لائبریری کو اس کے بیش قیمت اور نادر مخطوطات، قلمی تصاویر اور خطاطی کے اچھے نمونوں کی بنا پر عالم گیر شہرت حاصل ہے، جب سے لائبریری کی ذمہ داری ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے سنبھالی ہے، اس میں نئی روح آگئی ہے اور اس کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں، ۲۰۰۳ء میں مرکزی حکومت کی وزارت ثقافت نے قومی مشن برائے مخطوطات کے نام سے ایک قومی سطح کا پروجیکٹ شروع کیا ہے تاکہ ملک بھر میں منتشر مخطوطات کی شناخت اور فہرست سازی ہو سکے، ۲۷ اور اداروں کی طرح یہ کام رضا لائبریری کو بھی سپرد ہوا ہے، لائبریری کی طرف سے ایک باوقار جرنل وقار الحسن صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور مفید موضوعات پر سالانہ سمینار بھی ہوتے ہیں، اس سال کا سہ روزہ سمینار ”مخطوطات شناسی اور تحفظ“ کے عنوان سے ۱۹ تا ۲۱؍فروری کو ہوا جس کے افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر امیر حسن عابدی (دہلی) اور جناب کمال احمد صدیقی (دہلی) نے کی اور اسلامی جمہوریہ ایران کی ایمبسی کے کلچرل کونسلر جناب مرتضی شفیع شکیب اس کے مہمان خصوصی تھے، ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کی خیر مقدمی تقریر کے بعد ان تینوں کے علاوہ شاہ عبدالسلام (شعبہ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی)، ڈاکٹر عبدالمعید خاں (ڈائرکٹر مولانا ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک) اور پروفیسر شریف الحسن قاسمی (شعبہ فارسی دہلی یونی ورسٹی) کی تقریریں ہوئیں۔

۱۹؍کو دوپہر بعد سے ۲۱؍فروری کی شام تک مقالات کے جلسے اور ان پر مباحثے ہوتے رہے، جن میں نیشنل آرکائیوز دہلی اور بھوپال، دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو وتاریخ، بنارس ہندو یونی ورسٹی کے شعبہ اردو وفارسی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، محکمہ آثار قدیمہ دہرہ دون، مولانا ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، خدا بخش لائبریری پٹنہ، دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نمائندوں اور رام پور کے متعدد اصحاب علم وقلم اور رضا لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے مخطوطات کی اہمیت، تحفظ، شناخت، عربی رسم الخط، فہرست سازی، تدوین وتحقیق متن، کاغذ، ترقیمے، عرض دیدہ، مہروں، مطالعہ مخطوطات کی سرگذشت وتعارف مخطوطات پر مضامین پڑھے، راقم نے اپنے مقالے میں اسلام کے ابتدائی دور کے مخطوطات اور ان کے تحفظ کے اہتمام پر گفتگو کی، آخری اجلاس میں خاص خاص لوگوں

نے سمینار کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے، سمینار کا موضوع اہم تھا، اکثر مقالے موضوع کے شایان شان تھے۔

سرسید اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے سرسید کی تصانیف اور تحریروں کی اشاعت کے منصوبے کے تحت حال ہی میں یہ تین کتابیں شائع کی ہیں: ۱- تاریخ فیروز شاہی، ۲- آئین اکبری، ۳- تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل، یہ سب سرسید کی زندگی میں چھپی تھیں مگر اب ناپید ہورہی تھیں، اس لیے ان کے عکسی اڈیشن کی اشاعت بھی غنیمت ہے، اول الذکر دونوں کتابیں سرسید کی تصحیح کردہ اور موخر الذکر ان کی تصنیف ہے، اول الذکر میں سرسید کا دیباچہ پہلی بار شائع ہوا ہے، دوسری کتاب سرسید کے حواشی سے مزین ہے، دونوں کے مندرجات کی فہرست اور اشاریے یونی ورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق استاد ڈاکٹر محمد معتصم عباسی نے بڑی محنت اور قابلیت سے تیار کیے ہیں، تیسری کتاب تین حصوں میں ہے، پہلا حصہ دس مقدمے اور دو تتمے پر مشتمل ہے، دوسرے حصے میں توریت کی کتاب پیدائش شامل ہے، ان دونوں کے متون اردو اور انگریزی میں ہیں، تیسرے حصے میں انجیل متی کے پانچ ابواب کا متن صرف اردو میں ہے جو تصانیف احمدیہ جلد اول حصہ دوم مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۷ء سے ماخوذ ہے، تینوں کتابوں کی قدروقیمت کو اکیڈمی کے لائق ڈائرکٹر ڈاکٹر اصغر عباس کے مقدمے نے بڑھا دیا ہے، ان مقدموں سے ان تصنیفات کی اہمیت اور سرسید کی محنت و جاں فشانی کے علاوہ کتابوں کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے۔

جنوری سے برابر اعلان کیا جارہا ہے کہ پاکستان میں دارالمصنفین کی کتابوں اور معارف کے شائقین اپنی رقوم حافظ سجاد الٰہی صاحب لاہور کو بھیج کر اپنی منی آرڈر رسید دفتر دارالمصنفین کو روانہ کردیں، جن لوگوں نے معارف کے چندے حافظ محمد یحییٰ صاحب کراچی کو بھیجے تھے اور ان کے چندے ختم ہوگئے ہیں، وہ بھی اپنے چندے حافظ سجاد الٰہی صاحب کو بھیجیں، ان کا صحیح پتہ معارف کے کسی صفحے پر درج ہے، اندرونی ٹائٹل پر دیا گیا پتہ غلط ہے، اپریل کے شمارے سے اسے صحیح کردیا جائے گا۔

مقالات

فیصل ایوارڈ یافتہ علامہ محمود شاکر کی

''حیاۃ متنبی من شعرہ'' کی اہمیت

از:- پروفیسر محمد راشد ندوی☆

بیسویں صدی میں عربی نثر نگاری کو جو ترقی اور فروغ حاصل ہوا، اس سے اس زبان کی معنوی اور ظاہری اہمیت و حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، تقریباً آٹھ دہائی میں مصر میں ہر موضوع پر جو اہم کتابیں اور مقالے وجود میں آئے، اس سے اس زبان کی ترقی اور اس کی معنوی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، عربی نثر نگاری نے ہر موضوع پر ترقی کی ہے، صحافت، سیاست، سماجیات، افسانہ، ناول، تنقید اور تحقیق جیسے اہم موضوعات پر کتابوں کا ایک سلسلہ ہے اور ہر کتاب کی اپنی جگہ پر حیثیت اور اہمیت ہے، اس لیے ایک کتاب کا دوسری کتاب اور ایک ادیب کا دوسرے ادیب سے موازنہ کرنا صحیح اور مناسب نہیں ہے، کیوں کہ ہر ادیب اور صاحب فن کا مزاج ہوتا ہے، اس کی تعلیم و تربیت اور خاندان کا پس منظر ہوتا ہے، علاقے اور زمانے کے اثرات ہوتے ہیں، اس لیے جن لوگوں نے شخصیات یا کتابوں کا موازنہ کیا وہ کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے اور نہ اس موازنے سے پڑھنے والوں کو کوئی خاص فایدہ ہوا، ہاں اتنا ہوسکتا ہے کہ نثر نگاری کا جو تسلسل رہا ہے اور اس کی جو مختلف سمتیں رہی ہیں، ان کے پیش نظر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس تسلسل اور ان سمتوں میں فلاں ادیب کی کیا حیثیت ہے یا فلاں کتاب کی کیا اہمیت ہے اور اس دھارے میں وہ اپنا مقام کہاں متعین کر پا رہی ہے، اس طرز کے مطالعہ سے قارئین کو بھی فایدہ ہوتا ہے اور اس

☆ معرفت شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

سے زبان کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے اور مختلف علاقوں میں جو شخصیات وجود میں آئی ہیں، ان کے علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکتا ہے، لہذا محبت کا یہ سلسلہ ہر لحاظ سے مفید اور مناسب ہوتا ہے۔

میری حقیر رائے میں جدید دور کی جن شخصیات اور ان کی علمی کاوشوں نے نثر نگاری کے دھارے اور اس کی مختلف جہتوں کو مضبوط بنانے میں اور فنی اعتبار سے اس کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں چار اشخاص کو کسی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ ہیں لطفی السید، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، عباس محمود العقاد اور محمود محمد شاکر، ان چاروں نے اپنے اپنے انداز میں عربی زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے، اس لحاظ سے ان کے اکتسابات اور علمی کاوشیں عربی زبان و بیان کے لیے نعمت عظمی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

لطفی السید

سب سے پہلے اس میدان میں لطفی السید کا نام لیا جاتا ہے، انہوں نے بہت زیادہ کتابیں نہیں تصنیف کیں لیکن ان کی چند کتابیں اور ان کے سیاسی، سماجی اور علمی مقالات جو ان کے مجلہ الجریدۃ میں شایع ہوئے ہیں، وہ عرب اور خاص طور پر مصری نوجوان ادبا کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جتنے زبان و بیان کے ماہر اور اہم لوگ ہیں، سب نے ان کو استاذ کی حیثیت دی ہے، خاص طور سے یہ ادبا جنہوں نے بعد میں عرب نوجوانوں کی صحیح معنی میں ادبی، علمی اور تنقیدی رہنمائی کی ہے، ان میں طہ حسین، توفیق الحکیم، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، عباس محمود العقاد، محمود تیمور وغیرہ لایق ذکر ہیں، جنہوں نے لطفی السید کو استاذ کے مقام پر رکھا اور ان سب کے اتفاق کے بعد استاذ لطفی السید کو استاذ الجیل کا لقب دیا گیا، درحقیقت وہ اس لقب کے ہر لحاظ سے مستحق تھے، لیکن السید کا ارسطو کا عربی ترجمہ اور اس کے مقالات جس نوعیت اور اہمیت کے تھے اور انہوں نے عربی نثر نگاری کے لیے محکم اور ٹھوس بنیادوں پر آگے بڑھنے کی جو راہیں ہموار کیں، اس سے ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا پتا چلتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شروع میں زبان و ادب کی اگر صحیح رہنمائی ہوجاتی ہے تو اس سے زبان کا تسلسل باقی رہتا ہے اور وہ ہر لمحہ ترقی کے راستے پر گامزن رہتی ہے۔

لطفی السید خاموش طبیعت کے مالک تھے لیکن ان میں جو گہرائی و گیرائی تھی اس کی

جھلک ان کی تحریروں میں پوری طرح نمایاں ہے، ان کی مجموعی زندگی اور ان کے تمام علمی کارناموں اور تحقیقات کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان میں جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں، مصر میں جن تعمیری کاموں کی طرف انہوں نے قدم بڑھایا اور ان کو اپنی تحریروں سے نوجوانوں کے ذہن تک منتقل کرنے کی کوشش کی، اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ ہندوستان کی دو مفکر شخصیتوں سے بڑی حد تک ملتے جلتے نظر آتے ہیں، پہلی شخصیت سرسید احمد خاں کی اور دوسری مہاتما گاندھی کی، سرسید جس انداز میں اپنی تحریروں کو پیش کرتے ہیں اور ہر منزل کی طرف پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے ہیں اور جس انداز میں اپنی تحریریں پیش کرتے ہیں، وہ جامعیت اور معنویت کا عجیب مرقع بن جاتی ہیں اور وہ اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کا رویہ کبھی بھی جارحانہ نہیں رہتا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب سے ہاتھ ملاتے بلکہ دل ملاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی بات کہہ جاتے ہیں، یہی حال گاندھی جی کا بھی ہے، جنہوں نے ہندوستان کی قیادت میں اہم رول ادا کیا، ہر طرح کے لوگوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا، ان کو اپنے دل سے قریب کرلینا اور پیار و محبت کے ساتھ اپنی بات کو منوا لینا، گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے یا یوں کہا جائے کہ ان کی زندگی کے فلسفہ کی سب سے بڑی کامیابی ہے، تو اس طرح لطفی السید نے مصر کے نوجوانوں پر اپنی فکر و فن اور سنجیدگی و آگہی کے جو نقوش چھوڑے وہ تمام عرب ممالک کے نوجوانوں پر یکساں ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

لطفی السید کے ہم نواؤں اور خاص عقیدت مندوں میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کا نام سب سے پہلے آتا ہے، ہیکل مصر کے ایک خوش حال خاندان میں پیدا ہوئے، خاندانی وجاہت کے ساتھ ساتھ ہیکل کے اندر اعلا انسانی قدروں کی جستجو بھی شروع سے نمایاں نظر آتی ہے، اسی پس منظر میں انہوں نے مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مطالعہ میں ان کی کتابوں کو پیش نظر رکھا، جس میں زبان و بیان اور فکر و فن کے ساتھ ساتھ اعلا انسانی قدریں نمایاں نظر آتی ہیں، ڈاکٹر ہیکل ثانوی تک سائنس کے طالب علم تھے اور ان کے خاندان والوں کی خواہش تھی کہ وہ انجینئر یا ڈاکٹر بنیں اور خود ہیکل نے اپنے ذہن کو اس کے لیے تیار رکھا تھا، سائنس کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے انگریزی زبان کا اچھا خاصا مطالعہ کرلیا تھا اور انگلستان جانے کا فیصلہ کرلیا تھا،

ان کے والد نے اپنے بیٹے کو انگلستان روانہ کرنے سے پہلے استاذ الجیل لطفی السید سے مشورہ کرنے کے لیے ان کے گھر کا رخ کیا، اپنے ساتھ ہیکل کو بھی لے گئے، لطفی السید نے ہیکل کے والد کی بات سنی، بات سننے کے بعد انہوں نے ان سے صاف لفظوں میں کہا کہ میری رائے میں اس وقت انجینئرنگ اور میڈیکل کی تعلیم سے زیادہ اہم انسانی علوم کی تعلیم ہے اور ذہین و باصلاحیت نوجوان اگر اس طرف قدم بڑھائیں گے تو ملک وملت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوں گے، میری رائے میں ہیکل کو پہلے قانون کی تعلیم مصر میں دلائی جائے اور اعلا تعلیم کے لیے انہیں فرانس بھیجا جائے، ہیکل کے والد نے بے چوں وچرا لطفی السید کی رائے کو مان کر یہ فیصلہ کرلیا کہ ہیکل پہلے مصر میں قانون کی تعلیم حاصل کریں گے اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری فرانس سے حاصل کریں گے۔

لطفی السید کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مصر اس وقت جن حالات سے دوچار ہے اور یہاں جو فکری اور سیاسی کشمکش ہے تو اگر یہاں کے نوجوان یوروپ جا کر مغربی فکر وثقافت کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرلیں اور اس کے بعد مشرقی علوم اور یہاں کے ثقافتی و سیاسی دھاروں سے پوری واقفیت حاصل کرلیں تو یہ چیز نوجوانوں کے لیے مفید ہوگی اور اس کے بعد ملک کو بھی ہر طرح کا فائدہ حاصل ہوگا، ہیکل نے مصر سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فرانس سے اعلا ڈگری حاصل کی، فرانس میں دوران قیام وہ مصری ثقافت اور سماج کا بھی خاموشی سے مطالعہ کرتے رہے اور مصری سماج کی بدحالی اور بے کسی کے نقوش ان کے دل میں اتنے گہرے ہوتے گئے کہ ان کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی نگارش ''زینب'' میں کیا ہے، فنی حیثیت سے اس کتاب کی جو اہمیت ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن جو چیز خاص طور سے اس میں جلوہ گر ہے وہ ہے ہیکل کی مصر کے چپہ چپہ سے محبت، جس طریقہ سے انہوں نے مصر کے عوام خاص طور سے مصری کسان، مصری دیہات اور گاؤں کے کھیتوں کی تصویر کشی کی ہے، اس سے عربی زبان و ادب میں ایک اہم موڑ آیا جس میں ثقافت کے تنوع کے ساتھ محبت اور عقیدت کی لہریں ہر ہر لفظ میں نمایاں نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہیکل کو اس میدان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے، فرانس سے واپسی کے بعد لطفی السید کی نگرانی اور سرپرستی میں انہوں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا اور انہیں

کے مشورے سے روزمرہ کے مسایل پر لکھنا شروع کیا، ظاہر ہے ہیکل نے اس مرحلے تک اپنے کو ہر لحاظ سے مضبوط تر بنالیا تھا، اس لیے جو بھی لکھتے تھے اس میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ پختگی بھی ہوتی تھی، ان کے یہ مقالات لطفی السید کے رسالہ میں چھپتے تھے، لطفی السید کے المجلہ میں کسی نوجوان مضمون نگار کا کوئی مضمون چھپ جانا سند کی حیثیت رکھتا تھا، ہیکل نے سیاسی وسماجی مضامین کے ساتھ ادبی موضوعات کی طرف بھی اپنے قدم کو بڑھایا اور مصر کی اہم شخصیات پر لکھنا شروع کیا، اسی کے ساتھ مغرب کے وہ مصنفین جن کے فکری اثرات مغرب میں تھے، ان کے بارے میں بھی لکھنا شروع کیا، اس طرح عرب نوجوانوں کو مغرب ومشرق کے علوم وثقافت سے واقفیت اور آگہی ہیکل کے مقالات سے ہوتی گئی۔

ہیکل کی تحریروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، یہاں اس تفصیل میں نہیں جانا ہے لیکن اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ ہیکل مختلف راہوں اور دھاروں سے گزرتے ہوئے اسلامی ثقافت اور اسلامی فکر کی طرف بڑھے جس میں ان کو ایک نئی دنیا نظر آئی بلکہ یوں کہیے کہ ایک نئی روشنی نظر آئی، ہیکل کے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ عرب نوجوانوں کو اس روشنی سے زندگی کی صحیح راہیں مل سکتی ہیں جن پر چل کر ان کو سکون واطمینان نصیب ہوگا، چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں حیاۃ محمدؐ، حیاۃ عمرؓ اور حیاۃ ابوبکر الصدیقؓ جیسی اہم کتابیں جن میں اسلامی ثقافت، اسلامی فکر اور انسانوں کے لیے اعلا قدریں موجود تھیں، بڑے ہی علمی اور ادبی انداز میں پیش کیں، اس طرح ہیکل کا یہ دوسرا علمی وادبی کارنامہ ہے، ان کتابوں کے ذریعہ سے ہیکل نے جدید عربی نثر نگاری کی صحیح راہیں متعین کیں اور زبان وادب کے دھارے کو جو سمت عطا کی اس کی یہ دولت زبان بہت تیزی سے بہتی ہوئی اور لہراتی ہوئے آگے بڑھتی رہی اور عرب نوجوانوں کی صحیح معنی میں رہنمائی اور تربیت کرتی رہی۔

عباس محمود العقاد

اس کے بعد ہم عباس محمود العقاد کا ذکر کریں گے جنہوں نے آسانی سے اس دھارے کو قبول کیا اور اپنی ہمت ومطالعہ اور اپنے ذوق وشوق سے عربی نثر نگاری کو تیزی سے آگے بڑھایا، عقاد کی خاندانی حیثیت معیشت کے اعتبار سے لطفی السید اور ہیکل کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی، ان کے والد حکومت کے ایک آفس میں معمولی درجہ کے ملازم تھے، اس لیے عقاد کے

لیے آگے بڑھنے کی وہ راہیں نہیں تھیں جو ہیکل کو نصیب تھیں لیکن قدرت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ اگر انسان کسی چیز سے محروم رہتا ہے تو قدرت اس کو دوسری نعمت سے ایسا نوازتی ہے کہ اس کے دل ودماغ سے محرومی کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور اس کے دل میں امنگ وحوصلہ ایسی طاقت عطا کردیتی ہے کہ اس کی یہ دولت وہ زندگی کی مشکل گھاٹیوں کو ہنستے اور کھیلتے ہوئے پار کرجاتا ہے اور اپنے لیے ترقی کی تمام راہیں خود بخود متعین کرتا ہے، گویا ایسا لگتا کہ ترقی کی راہیں اس کے لیے خود بخود کھل رہی ہیں اور وہ ایک منزل سے دوسری منزل تک بڑی آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

عقاد نے جس دور میں علمی میدان میں قدم رکھا، سیاسی، سماجی اور ادبی وعلمی اعتبار سے وہ کشمکش کا دور تھا لیکن یہ کشمکش درحقیقت ہر اعتبار سے ترقی کی علامت تھی، چنانچہ عقاد نے اپنے حوصلہ اور امنگ کی یہ دولت ہر میدان میں قدم رکھا، سیاست، ثقافت، اسلامیات، ادب، تنقید اور یہاں تک کہ شاعری میں بھی اور ہر میدان میں اس بات کی کوشش کی کہ صف اول میں ان کا مقام رہے اور یہ حقیقت ہے کہ عقاد نے جوانی سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک جو کچھ لکھا ان کی تحریروں کا ایک ہی انداز تھا، کہیں اس میں اتار چڑھاؤ نظر نہیں آتا، ایسا لگتا ہے کہ پختگی اور سنجیدگی عقاد کی فطرت میں شامل تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے تھے، اس کے ہر پہلو پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرتے تھے اور اس سلسلے میں جو بھی مواد درکار ہوتا تھا اس کو بہت ہی محنت اور جاں فشانی سے جمع کرتے تھے اور اپنے لکھنے کی اعلا صلاحیت کی یہ دولت وہ مضمون ہر لحاظ سے اعلا اور اتم ہوکر منظر عام پر آتا تھا، عقاد کی تحریروں کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن ہم یہاں ان کی ان تحریروں کا ذکر کریں گے جو خالص ادبی، تحقیقی اور تنقیدی ہیں اور جن سے عربی نثر نگاری کو دنیا کی اعلاتر زبانوں میں ایک حیثیت حاصل ہوئی اور عقاد اپنی محنت اور ذہنی اپج کی یہ دولت دنیا کے اعلا درجہ کے مصنفین میں شمار ہونے لگے، یہاں ہم اس کتاب کا ذکر کریں گے جس کے ذریعے سے آگے کی نثر نگاری کی راہ متعین کرنے میں آسانی ہو۔

عقاد کی کتاب حیاۃ ابن الرومی کو میں عقاد کی تحریروں کا شاہکار سمجھتا ہوں اور میری حقیر رائے میں اس کتاب سے پہلے اس پایے کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی، عقاد نے اس کتاب کی تصنیف میں تنقید، تحقیق، تجزیہ، سیرت نگاری، تاریخ نگاری، اسلامی علوم وفنون، عربی زبان و

ثقافت کو اس انداز میں مرتب کیا ہے کہ اس سے عقاد کی ذہنی اور فکری وسعت کے ساتھ ساتھ مسایل کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی صحیح راہ متعین کرنے میں کتنی قدرت حاصل تھی، ابن الرومی تیسری صدی ہجری کا بڑا شاعر تھا اور تیسری صدی ہجری اگر علم وثقافت کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کا سنہرا دور شمار ہوتا ہے تو سیاسی لحاظ سے جو بدنظمی وبدحالی تھی وہ ناقابل بیان ہے، مختلف مذاہب اور فرقوں کے نظریات وعقاید جو مختلف راہوں سے اسلامی ثقافت وادب میں آگئے تھے، اس سے عوام وخواص کے ذہن میں جو انتشار وخلفشار تھا اس کی وجہ سے اسلامی عقاید کی دیواریں متزلزل ہورہی تھیں، ابن الرومی کی شاعری میں یہ جو ذہنی وفکری تبدیلیاں آئی تھیں اور جو سیاسی ومعاشرتی ابتری تھی، اس کے اثرات اس کی شاعری میں پائے جاتے ہیں اور خود ابن الرومی کا ذہن بہت ہی معقد تھا، فطری طور پر وہ بہت ہی حساس تھا اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ جاتا تھا اور زندگی کے ہر مسئلہ میں اسے شک وشبہ پیدا ہوجاتا تھا اور وہ بدحالی کا حد درجہ شکار تھا، یہاں تک کہ کوئی گھر سے نکلا اور ایسا آدمی نظر آگیا جو شکلاً اچھا نہ ہو یا کوئی ایسا جانور نظر آگیا جس کو سماج میں اچھا نہیں سمجھا جاتا یا کوئی ایسی چڑیا بول دی جس کی آواز منحوس مانی جاتی تھی تو ابن الرومی کئی کئی دن تک گھر سے باہر نہیں نکل پاتا، گویا وہ نفسیاتی طور پر کم زور تھا لیکن وہ بڑا شاعر تھا اور عقاد نے بڑے دھیان سے اس کی شاعری کے بعض موضوعات خاص طور پر وصف اور منظر نگاری (تصویرکشی) کا مطالعہ کیا، ابن الرومی دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتا ہے، عقاد نے اس سلسلہ میں اس کے اشعار کے نمونے بھی پیش کیے ہیں، اس طرح عقاد کی یہ کتاب تنقید وتحقیق، تجزیہ وتحلیل اور زبان وبیان کے اعتبار سے اعلا درجہ کی ہی نہیں بلکہ عربی نثر نگاری کو ایسی طاقت عطا کرتی ہے جس سے آنے والی نسلوں کو رہنمائی اور روشنی ہی نہیں بلکہ طاقت وتوانائی نصیب ہوگی اور اس سلسلہ کی اہم کڑی علامہ محمود شاکر کی کتاب حیاۃ متنبی من شعرہ ہے، فنی اور علمی حیثیت سے اس کی حیثیت پر ہم گفتگو کریں گے۔

علامہ محمود شاکر

علامہ محمود شاکر کا خاندانی پس منظر ان تینوں ادیبوں سے کچھ مختلف تھا، ان کے خاندان میں دولت کی فراوانی تو نہیں تھی لیکن علم کی روشنی سے پورا خاندان منور تھا، گویا محمود شاکر کی تعلیم وتربیت ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں علم وادب کا بول بالا تھا، ان کے والد کا شمار مصر

کے مشہور علما میں ہوتا ہے، انہوں نے عدلیہ کے محکمہ میں قاضی کے عہدے سے زندگی شروع کی اور ترقی کرتے کرتے سوڈان ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے منصب پر سرفراز ہوئے، اس زمانہ میں اس عہدے پر انہیں لوگوں کا تقرر ہوسکتا تھا جو علمی رکھ رکھاؤ کے ساتھ دیانت اور امانت کے اعتبار سے بھی مشہور ہوا کرتے، کچھ عرصہ سوڈان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس کے بعد مصر واپس آئے، وہاں انہیں جامع ازہر کا وکیل یعنی پرو وائس چانسلر مقرر کیا گیا، یہ عہدہ اس زمانہ کا سب سے اہم اور موقر عہدہ شمار ہوتا تھا، شیخ الازہر اور وکیل الازہر دونوں کی حیثیت کابینہ وزیر کے مساوی ہوا کرتی تھی اور ظاہری جاہ وجلال کے اعتبار سے سماج اور عوام میں وہ زیادہ موقر اور محترم تھا۔

محمود شاکر کے بڑے بھائی محمد شاکر کی تعلیم بھی ازہر میں ہوئی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بھی محکمہ عدلیہ میں جج کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور ترقی کرتے کرتے سپریم کورٹ میں سنی لا کے جج مقرر ہوئے، عدلیہ کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ محمد شاکر نے علمی مطالعہ کو بھی جاری رکھا اور اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ لغت اور ادب کی کتابوں کا بھی مطالعہ بڑی دل چسپی اور گہرائی سے کرنا شروع کیا، چنانچہ وہ مصر کے علمی وادبی حلقوں میں ایک موقر عالم اور محقق کی حیثیت سے متعارف ہوئے، یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ عدلیہ کی روزمرہ مشغولیات کے ساتھ ساتھ تحقیق وتصنیف میں بھی اعلا مقام حاصل کیا۔

اس طرح محمود شاکر نے اپنے والد اور بھائی کو جس جاہ وجلال کے عالم میں دیکھا، ان کا بھی علمی وادبی ذوق چٹکیاں لینے لگا، وہ اسکول میں داخل کیے گئے، ثانویہ عامہ (انٹرمیڈیٹ) تک وہ سائنس کے طالب علم تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے مطالعہ کا شوق بھی پیدا ہوا اور حسین المرصفی سے انہوں نے حماسہ اور الکامل للمبرد کو سبقاً سبقاً پڑھا، اس کے ساتھ علمی وادبی حلقے سے اپنے کو قریب رکھا، اس وقت مصر میں احمد تیمور پاشا کا خاندان سب سے اہم اور ہر دل عزیز شمار کیا جاتا تھا، ان کا گھر کیا تھا ایک محل تھا اور شام میں عام طور سے مصر کے بڑے ادباء وشعراء اور علماء کا اجتماع ان کے گھر میں ہوتا تھا اور اس وقت کے حالات کے مطابق وہاں ان کی خاطر مدارات ہوتی تھی، اس طرح محمود شاکر علماء کے ممتاز لوگوں سے قریب

ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ اپنے علمی وادبی ذوق کو ابھارنے اور نکھارنے میں لگے رہے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد ان کو داخلہ لینا تھا، وہ سائنس کے طالب علم تھے لیکن ان کا رجحان سائنس کی طرف نہیں بلکہ آرٹس کی طرف تھا اور فیکلٹی آف آرٹس میں جب انہوں نے داخلہ کی درخواست دی تو داخلہ کے سلسلے میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، کیوں کہ سائنس کے طالب علم کا داخلہ سائنس میں ہی ہوسکتا تھا لیکن اس وقت طہٰ حسین قاہرہ یونی ورسٹی میں استاذ تھے اور یونی ورسٹی میں ان کا بڑا احترام تھا، انہوں نے وائس چانسلر سے سفارش کی کہ سائنس کے طالب علم کو آرٹس میں داخلہ نہ دینا ظلم ہے، آرٹس کا دروازہ سب کے لیے کھلا رہنا چاہیے، چنانچہ محمود شاکر کا داخلہ فیکلٹی آف آرٹس میں ہوا اور شعبۂ عربی سے وہ منسلک ہوئے، طہٰ حسین اس وقت شعبۂ عربی سے منسلک تھے، فرانس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب ان کا تقرر قاہرہ یونی ورسٹی میں ہوا تو یہ عہدہ طہٰ حسین کے لیے اعزاز کا باعث تھا اور ان کی وجہ سے یونی ورسٹی کو بھی بڑا اعزاز حاصل ہوا، قاہرہ یونی ورسٹی میں اس وقت مصری اساتذہ کے ساتھ ساتھ فرانس، انگلستان، جرمن، اٹلی کے اساتذہ کی بڑی تعداد تھی، اسی طرح قاہرہ یونی ورسٹی کو جدید علوم کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اعلا درجہ کا امتیاز حاصل تھا۔

علامہ محمود شاکر نے قاہرہ یونی ورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، وہ بہت خوش تھے کہ ان کے ذوق کے مطابق ان کو داخلہ مل گیا، لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ اس یونی ورسٹی میں بہت دن تک نہیں رہ پائیں گے، طہٰ حسین نے فرانس سے واپسی کے بعد تعلیم وتدریس کے نہج میں بڑی حد تک تبدیلی کی اور خاص طور سے پرانے نہج کو بدلنے میں انہیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اندر سے مضبوط تھے اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نئے طریقۂ تعلیم کو نافذ کرنے میں کامیاب ہوگئے، درسی کتابوں کی تدریس سے ہٹ کر انہوں نے علمی وادبی موضوعات پر لکچر کا سلسلہ شروع کیا اور یہ طریقۂ تدریس وتعلیم وہ فرانس سے لائے تھے، اتفاق سے انہیں جاہلی ادب کی تعلیم وتدریس کا موضوع تفویض کیا گیا، چنانچہ وہ بڑی ہمت اور بے باکی سے اس مضمون کو اپنے ذوق وشوق سے پڑھانے لگے، عام طور سے طلبا کو ان کا لکچر بہت پسند آیا کیوں کہ مواد اور زبان دونوں اعتبار سے ان کو جو مہارت اور قدرت حاصل تھی، وہ نوجوانوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی، اپنے لکچرس میں

انہوں نے جاہلی دور کی شاعری کا آہستہ آہستہ انکار کرنا شروع کیا اور آخر میں اس نتیجہ پر طلبا کو لانا چاہتے تھے کہ جاہلی دور کا ادب افسانہ ہے، نہ اس کا کوئی وجود ہے نہ حقیقت۔

محمود شاکر صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ نظریہ من وعن یوروپ سے لیا گیا ہے اور سب سے پہلے مارگولیتھ نے اس پر مضمون لکھا تھا اور اس مضمون کی نشان دہی مصر کے مشہور ادیب و محقق احمد تیمور نے کی تھی، انہوں نے محمود شاکر صاحب کو وہ مضمون پہلے ہی دکھا دیا تھا اور اس کو پڑھ کر وہ کافی برہم تھے، چنانچہ محمود شاکر صاحب نے طہٰ حسین کی کلاس ہی میں مخالفت کی اور اس مخالفت نے یہاں تک شدت اختیار کی کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے، محمود شاکر صاحب نے جذبات کی رو میں آکر یونی ورسٹی کو خیر باد کہا اور یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کیا کہ جس یونی ورسٹی میں اچھی بات بتانے کے بجائے گمراہ کن باتیں سکھائی جائیں اس سے کیا فایدہ، چنانچہ وہ یونی ورسٹی سے الگ ہوگئے، اب ان کے سامنے آگے کے تمام مراحل مسدود تھے، کیا کریں؟ پیسہ نہیں کہ تجارت کریں، کھیتی نہیں کہ کاشتکاری کریں، باپ کی دولت کے سہارے کب تک زندہ رہیں گے؟ وہ اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ذہنی کشمکش اور تاریکی کے عالم میں انہیں ایک روشنی نظر آئی اور وہ روشنی علم کی تھی جو یہ بول رہی تھی کہ جب زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں اور مایوسی اپنے دامن میں لپیٹ لے تو مجھ کو اپنا لو، اگر کسی نے مجھ کو اپنایا تو کبھی ناکام نہیں ہوگا، میرے نزدیک سب برابر ہیں، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، شہزادہ ہو یا گاؤں کا کسان، جس نے مجھ کو اپنا لیا وہ ترقی کی اعلا منزلوں پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکا، ابو فراس ہمدانی شہزادہ تھا اور متنبی ایک گمنام باپ کا بیٹا تھا لیکن شاعری کے میدان میں یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ کس کا پلڑا بھاری ہے، ابن المعتز شہزادہ تھا اور ابن الرومی مفلوک الحال خاندان کا ایک فرزند تھا لیکن دونوں کو شاعری کے میدان میں جو شہرت حاصل ہوئی یہ کہنا مشکل ہے کہ کون کم اور کون زیادہ ہے۔

محمود شاکر کی زندگی کا یہ ایک حسین لمحہ تھا کہ اس روشنی نے انہیں مایوسی اور ذہنی کشمکش سے نکال کر ایک شاہ راہ پر ڈال دیا اور ان کے دل میں یہ بات الہام ہوئی کہ قرآن کی زبان کو نظر انداز کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے یا اس کو کم تر ثابت کیا جارہا ہے، اس زبان کو اپنے مطالعہ کا

میدان بنایا جائے، چنانچہ انہوں نے جاہلی دور کی شاعری کا مطالعہ کیا اور اس نظریہ کے تحت کہ جب تک اس زبان کی شاعری کو مربوط شکل میں نہ پڑھا جائے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، چنانچہ اسی دھن اور اسی لگن کے ساتھ انہوں نے جاہلی دور کی شاعری کو پڑھنا شروع کیا اور دس سال تک مسلسل اس دور کی شاعری کا مطالعہ جاری رکھا اور اس دور کے جتنے شعراء اور جتنے دواوین تھے ان کو جمع کیا اور جن شعراء کے دواوین نامکمل تھے، ان کے اشعار ادب، تاریخ اور سیرت و تراجم کی کتب سے جمع کر کے مرتب کیا اور ہر دیوان کو نئے انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی، اس طرح دس سال کی مسلسل محنت و جد و جہد اور رات دن کی لگن سے ان پر بہت سے حقایق کا انکشاف ہوا اور اس دور کی شاعری کی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس سے رابطہ و تعلق بھی پیدا ہوا، کیوں کہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس دور کی شاعری پر جب تک پوری طرح سے کمال حاصل نہ ہو اس وقت تک قرآن مجید کا اعجاز سمجھ میں نہیں آئے گا، گویا جاہلی دور کا ادب و شاعری ایک لحاظ سے کلام مجید کا محافظ اور دوسرے اعتبار سے اس کی تہوں تک پہنچنے میں معاون و مددگار ہے۔

محمود شاکر صاحب اس دھن میں مگن تھے کہ ۱۹۳۶ء میں المقتطف کے اڈیٹر فواد صروف نے متنبی کا ایک ہزار سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا اور علامہ محمود شاکر سے گذارش کی کہ اس خاص شمارہ کے لیے متنبی پر ایک مضمون دیں، المقتطف کے اڈیٹر کی گذارش محمود شاکر کے لیے آزمایش تھی، کیوں کہ وہ جس دھن اور لے پر اپنے علم و فن کے مراحل طے کر رہے تھے، متنبی ان کے لیے کچھ نیا تھا، اس وقت تک وہ اپنے علمی سفر میں متنبی کے زمانہ تک نہیں پہنچ پائے تھے، لیکن المقتطف کے اڈیٹر سے انہیں جو لگاؤ تھا اور متنبی کے سلسلے میں تھوڑا بہت جو ان کا مطالعہ تھا، اس لیے متنبی پر لکھنے کا فیصلہ انہوں نے کر لیا اور اپنے سفر کے راستہ کو تھوڑا سا انہوں نے موڑا اور متنبی تک پہنچے، انہوں نے علمی تحقیق و تنقید کے سلسلے میں جو اصول اور طریقۂ کار متعین کیا تھا، اس کے تحت متنبی کا مطالعہ انہوں نے شروع کیا اور متنبی پر ان کی جو معرکہ آرا تصنیف ہے، اس میں انہوں نے تفصیل سے اپنے اس طریقۂ کار کی تعیین کی ہے۔

ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کسی شاعر پر لکھنے سے پہلے اس کے دیوانوں کے نسخوں کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اور مطالعہ اس طرح ہو کہ لکھنے والا شاعر کے فکر و فن اور اس کے جذبات و

خیالات میں گم ہوجائے اور اسے یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ بھی اس فن کا حصہ ہے اور اس کے ساتھ جس زمانہ میں وہ پیدا ہوا اور جس میں اس کی شاعری آگے بڑھی اور پروان چڑھی اور پھر زندگی کے مختلف مراحل میں وہ جن حوادث زمانہ سے ہم کنار ہوا اور جن لوگوں نے اس کو محبت کی نظر سے دیکھا اور ان لوگوں کو جنہوں نے اسے زندگی کے ہر مرحلے میں نیچا دکھانے کی کوشش کی یا جو لوگ اس کے خون کے پیاسے تھے، ان تمام واقعات کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے، چنانچہ محمود شاکر نے متنبی کے دیوان کو شروع سے آخر تک دھن اور لے کے ساتھ پڑھنا شروع کیا اور مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے اس کے دیوان کی شرحیں لکھی ہیں ان کو بھی سامنے رکھا اور متنبی کے زمانہ اور بعد کی تاریخ، سیرت، تراجم و تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، ان کو متنبی کے بارے میں ایک لفظ بھی کسی کتاب میں ملتا اس کو سینہ سے لگا لیتے اور جس دھن اور ولولہ کے ساتھ انہوں نے متنبی کا مطالعہ شروع کیا اور ان کے بہ قول بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھنے لگیں اور دشمنوں نے طرح طرح کی جو تہمتیں لگائی تھیں، وہ خود بخود چھٹنے لگیں اور ان کے سامنے متنبی بڑا باحمیت اور خوددار شاعر کی شکل میں نمودار ہوا، جب متنبی کی صحیح شکل اور تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی تو اس وقت انہوں نے متنبی پر لکھنا شروع کیا اور چھ مہینہ مسلسل مطالعہ و تحقیق کے بعد ایک تفصیلی مقالہ جو ایک سو ستر (۱۷۰) صفحات پر مشتمل تھا لکھ کر المقتطف کے اڈیٹر کے حوالہ کیا، مقالہ اتنا جان دار اور زبان و بیان کے لحاظ سے بلند مرتبت اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے نیا اور نرالا تھا کہ المقتطف کے لیے جو مقالے آئے تھے، ان کو ایک طرف رکھ دیا اور صرف محمود شاکر صاحب کا مقالہ اس خاص شمارہ کے لیے منتخب کر لیا، جب یہ مقالہ چھپ کر سامنے آیا تو عرب ممالک کے ادیبوں نے اس انداز سے اس کا خیر مقدم کیا کہ اس کی مثال کم ملتی ہے، خود محمود شاکر کے مخالفین نے بھی اس کی غیر معمولی پذیرائی کی، طہ حسین اور عقاد نے کتاب کے بارے میں خود مقالہ نگار سے تعریف کی، محب الدین الخطیب، حسن زیات اور مصطفیٰ صادق الرافعی نے اس کتاب کو فکر و فن، زبان و بیان اور تحقیق و تنقید کا اعلا نمونہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمود شاکر نے اس تصنیف کے سلسلے میں ان اصولوں اور طریقوں کو اپنایا جن کی تعیین خود انہوں نے کی تھی، کتاب پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف شاعر

کی پیدائش سے لے کر شہادت تک ایک ایک لمحہ اس کے ساتھ ہے اور شاعر اپنی زندگی میں جن آلام و مصایب سے دوچار رہا، اس کے ذہن و قلب پر جو اثرات مرتب ہوئے اور قلق و الم کے جو لمحات اس نے کاٹے جس کی جھلک اس کی شاعری کے ایک ایک لفظ سے مترشح ہوتی ہے، مصنف ان آلام و مصایب کو دیکھ کر شاعر کی ان کیفیات کو بھی محسوس کرتا ہے اور جس انداز میں ان کو ترتیب دیتا ہے، پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ خود شاعر اپنی کہانی اپنی زبانی مصنف کو سنا رہا ہے اور وہ اس کو اپنے انداز میں پیش کر رہا ہے۔

متنبی کے سلسلے میں محققین و ناقدین اور سیرت نگاروں نے جو الگ الگ رائیں پیش کی ہیں، ان کی وجہ سے متنبی کی زندگی اور اس کی شاعری معمہ بن کر رہ گئی تھی اور عام طور پر لوگوں کو یہ بات ذہن نشین ہوگئی تھی کہ متنبی کا نہ کوئی کردار ہے اور نہ اخلاق، خاندانی طور پر اس کے ماں باپ کا پتا نہیں، اس وجہ سے وہ خود اعلا صفات سے محروم تھا، لوگوں کی مدح سرائی کر کے جیتا رہا، دولت اس کا مطمح نظر تھی اور اس کی شاعری چاپلوسی و تملق کا نمونہ ہے۔

علامہ محمود شاکر نے تحقیق و تنقید کے آئینہ میں متنبی کو پڑھا اور دیکھا، اس کے کلام کو اس کی زندگی کے مراحل کے اعتبار سے مرتب کیا اور متنبی کے مخالفین نے اس کے بارے میں جو غلط رائیں اور خبریں پیش کی تھیں، ان سب کو انہوں نے باطل قرار دے کر جو صحیح بات تھی اس کو پیش کیا اور اس کے کلام کی روشنی میں یہ بات ثابت کی کہ متنبی اپنے زمانے ہی کا بڑا شاعر نہیں تھا بلکہ عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا، اس کی شاعری میں اس کی زندگی، اس کا کرب، اس کے آلام، عرب ملکوں کی تباہی و بربادی، عربوں کی بے کسی و محرومی پوری طرح سے جلوہ گر ہے اور عرب خلفا کی کم زوری کی بہ دولت عجمیوں کا حکومت کے ہر شعبہ پر تسلط و غلبہ ہے اور وہ ظاہری طور پر مسلمانوں اور عربوں کا بھلا چاہتے ہیں لیکن اندر سے وہ مسلمانوں اور عربوں کی جڑیں کھودنے والے ہیں اور ہر اعتبار سے انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہیں کے ہاتھوں عباسی خلفا کی جو تباہی و بربادی اور عوام کے سامنے ان کی بے کسی ظاہر ہو رہی ہے، متنبی کو ان تمام حقایق سے غیر معمولی اذیت اور تکلیف ہوتی تھی، جس کو وہ صاف طریقہ سے بیان نہیں کر پاتا تھا لیکن اشارہ و کنایہ میں کہیں نہ کہیں ضرور ذکر کر دیتا تھا، اس لیے اس کو ایک جگہ قرار نہیں تھا، ایک شہر سے

دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک کی وہ خاک چھانتا رہا لیکن اس کو کہیں بھی سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوا، حقیقت یہ ہے کہ وہ عربوں اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ لانا چاہتا تھا اور عربوں کی حکومت جس کو عجمیوں نے غصب کرلیا تھا اور جس کی وجہ سے عربی زبان و ثقافت پر مسلسل زوال و اضمحلال طاری تھا، وہ اس کو ختم کرنا چاہتا تھا، وہ ایک خوددار اور عبقری شاعر تھا، اس نے بادشاہوں اور امرا کی بھی جو تعریفیں کی ہیں ان میں بھی اپنی ذات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، محمود شاکر نے اس کتاب کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور ہر کلچر کے پیچھے اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے اور جب تک زبان کے مزاج اور کلچر کے پس منظر سے آگہی نہ ہو تحقیق وتنقید کے میدان میں جو بھی چیزیں وجود میں آئیں گی، ان کی کوئی علمی حیثیت نہ ہوگی۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ دوسری صدی سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک جو اسلامی مملکت کے اندر وسعت پیدا ہوئی، اس میں شبہ نہیں کہ عربوں اور مسلمانوں کا بول بالا ہوا، سندھ سے لے کر اندلس تک عربی زبان وثقافت اور مسلمانوں کا جھنڈا ہر جگہ لہرا رہا تھا، یہ بھی ایک بڑا مسلمانوں اور عربوں کے لیے انعام تھا، لیکن جب کسی حکومت کے اندر وسعت پیدا ہوتی ہے تو ہر طرح کے نظریات وافکار اور ہر طرح کے عقاید ورجحانات سماج کے اندر اپنی جگہ بنالیتے ہیں، اس کی وجہ سے ایک ذہنی خلفشار کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اس ذہنی خلفشار و انتشار کی وجہ سے ہر علاقہ کے لوگوں کا ایک مزاج بن جاتا ہے اور وہ کسی نہ کسی عقیدہ کے حامی ہوجاتے ہیں، چنانچہ ظاہری سطح پر ایک یکسانیت نظر آتی ہے، لیکن نچلی سطح پر ایک ہیجانی کیفیت ہوتی ہے، کہیں معتزلہ کا بول بالا ہے، کہیں فاطمیوں کی گرفت ہے، کہیں شیعیت کا غلبہ ہے، کہیں حنبلیت کے ہم نوا ہیں، کہیں حکومت کے مؤید اور طرف دار ہیں، کہیں حکومت کے دشمن اور اس کو جڑ سے کھودنے والے ہیں۔

یہ تمام چیزیں وسیع اسلامی حکومت میں گھن کی طرح بڑھ رہی تھیں جس سے اسلامی سماج اور عربی ثقافت کی جڑیں کم زور سے کم زور ہوتی جارہی تھیں، اس لیے کوئی بڑا ادیب یا شاعر اور مصنف یا محقق ہو اس کا تعلق کسی نہ کسی فرقہ یا جماعت سے ہوجاتا تھا، اس کے کچھ حامی ہوتے تھے کچھ دشمن اور کتنے ہی ادیب وشاعر ایسے ہیں جن کو اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا، یہ سب ان ہی

ذہنی وفکری خلفشار کا نتیجہ ہے، اس لیے عموماً شعرا وادبا اپنے افکار کا اعلان کھل کر نہیں کرتے تھے، لیکن سازش کرنے والوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں اور اپنے مخالفین کا پیچھا کرنے میں وہ ذرہ برابر سستی نہیں کرتیں، متنبی بھی اسی دور کی دین ہے، وہ بہت بڑا شاعر تھا، خدا نے اس کو غیر معمولی ذہن دیا تھا، شاعری کے ساتھ اس کو تمام علوم وثقافت پر عبور تھا، اس زمانے کے عقاید ونظریات پر اس کی گرفت تھی، وہ جس عقیدہ کا حامی تھا اس پر اس کا ایمان کامل تھا، لیکن کھل کر اس کا اظہار نہیں کر پاتا تھا، تاہم دل میں جو بات رہتی ہے کبھی نہ کبھی زبان سے اس کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے۔

یہ مختلف عقاید ونظریات شہروں سے نکل کر قبایل تک پہنچ گئے تھے اور قبایل میں بھی اس طرح کی گروہ بندیاں تھیں، اس کے اثرات سماج میں پوری طرح سے نمایاں تھے، خلفا وامرا اور سلاطین کے درباروں میں متنبی کی رسائی ہوتی رہی، وہ وقت کے لحاظ سے ان کی جو تعریفیں یا مدح سرائی ہوسکتی تھی، کرتا تھا، لیکن اس کی مدح سرائی اس طرح کی ہوتی تھی کہ ممدوح کو بھی کبھی کبھی اس کے بارے میں شبہ ہوتا تھا کہ یہ تعریف ہے یا ہجو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں ایک خلش تھی، اس خلش کی وجہ سے وہ کبھی صاحب طریقہ سے اپنی بات نہیں کہہ پاتا تھا، چنانچہ وہ جتنا بڑا شاعر تھا، اس سے اس کے دشمن اس کے خون کے پیاسے تھے اور وہ اپنی جان کو بچاتا اور ملکوں کی خاک چھانتا رہا، کبھی وہ حلب میں ہے، کبھی دمشق میں اور کبھی قاہرہ میں اور جہاں بھی گیا اس کی شاعری میں اس کے سفر کی داستان اور روداد موجود ہے، اس لیے عربی زبان وثقافت پر جن لوگوں کی پوری گرفت نہ ہو اور وہ اس زمانہ کے مذہبی وسیاسی رجحانات اور جغرافیائی حالات پر پورا عبور نہ رکھتے ہوں، وہ متنبی کے کلام، اس کی فکر، اس کے نظریات، اس کے عقاید، اس کی امنگوں اور اس کے حوصلوں کو پوری طرح سے بیان نہیں کرسکتے۔

علامہ محمود شاکر سے قدرت کو یہ کام لینا تھا، انہوں نے جاہلی دور سے لے کر عباسی دور تک کی شاعری اور رجحانات ومیلانات کا غائرانہ مطالعہ کیا تھا، اس کی بہ دولت انہوں نے شاعر اور اس کے فن کو عالمانہ وادیبانہ انداز میں پیش کیا، محمود شاکر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ''الف'' سے ''ی'' تک پوری طرح پلاننگ کرتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کے قلم کی کمان کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی، چنانچہ شاعر کے فن اور اس

کے شعری کمالات، اس کے جذبات ور جحانات کو اس طرح سے لپیٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ ہر چیز اس میں جذب ہو جاتی ہے اور ہر لفظ سے حقایق، جذبات اور خیالات کی پوری ترجمانی ہوتی ہے، زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت ہے، اس لیے سلیس اور شگفتہ ترکیبوں میں اچھے اور بامعنی الفاظ اس طرح سے ڈھل جاتے ہیں کہ جیسے ہار میں نگینے جڑ دیے گئے ہوں، اس میں محمود شاکر صاحب کا کوئی مدمقابل نہیں، عباس محمود العقاد کی طرح وہ جب ادبی وفنی مسایل پر قلم اٹھاتے ہیں تو فکر کی ندرت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا اعلانمونہ سامنے آتا ہے، اس طرح دیکھا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو ان کی کتاب "حیاۃ متنبی من شعرہ" بیسویں صدی کی زبان و بیان اور تحقیق وتنقید کی شاہکار ہے، اس کتاب کی عظمت وحیثیت اور اس کی وقعت کو دیکھتے ہوئے عربی زبان وادب کے ادیبوں اور ناقدوں نے ان کا نام فیصل ایوارڈ کے لیے تجویز کیا اور انہیں ادب کا فیصل ایوارڈ عطا کیا گیا جو ان کی علمی اور ادبی قدردانی کی علامت ہے۔

مراجع

تفسیر طبری: تحقیق محمود شاکر، ج ۱،۲۔ حیاۃ متنبی من شعرہ: علامہ محمود شاکر۔
مقدمہ الطاہرۃ القرآنیۃ: مالک نبی۔ مقدمہ مصادر الشعرا الجاہلی: الدکتور ناصر الدین الاسد۔
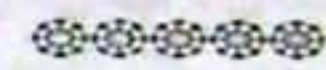
پاکستان میں دارالمصنفین کے نئے نمایندے

جناب حافظ سجاد الٰہی صاحب

Address

Office: 27 A, Peco Mall Godam Road
Loha Market, Badami Bagh
Lahore, Pakistan.

Phone: 03004682752

Home: 196, Ahmad Block Badar Street,
New Garden Town
Lahore, Pakistan.
Phone (R): 5863609

اقبالؒ کے تصورِ زمان پر اعتراضات کے جواب

از:- جناب طارق مجاہد جہلمی ☆

(۲)

وقت اور تقدیر کا آپس میں ربط انسان کی تقدیر کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے، اس کا مقصود و منتہا یہ ہے کہ اپنی فطری اور عقلی صلاحیتوں کو مکمل طور پر ترقی دے اور تہذیب و تمدن کو مکمل سے مکمل تر بنائے، اس کے علاوہ انسان کی اور کوئی تقدیر نہیں، اس کو اس کی تشکیل اس دنیا میں خود اپنے ہاتھ سے کرنی ہے، چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے، "خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت نہ بدلے"۔(۱)

اگر انسان دنیا میں عدل و انصاف، امن و آشتی اور صداقت و اخلاق کا دور دورہ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنے حسن عمل ہی سے وہ ان مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ اپنے نفس میں مناسب تبدیلی پیدا کرے، یہ مقاصد اور تبدیلیاں تمام کی تمام زمان ہی سے پایہ تکمیل تک پہنچتی ہیں، یہ معرض وجود میں تب آئیں گی جب ہم زمان کو حقیقی اور بامقصد سمجھیں، یہی اقبال کا مقصود ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں تقدیر سے متعلق یہ جو کہا کہ یہ زمانہ ہی کی شکل ہے، اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ "تقدیر وقت کو دیکھنے کے طریق کا نام ہے، کسی چیز کی تقدیر کے یہ معنی نہیں کہ قسمت باہر بیٹھ کر اسے کام کرنے والے کی طرح توڑ مروڑ رہی ہے، بلکہ تقدیر کسی شے کی داخلی ممکنات کا نام ہے جو بیرونی دباؤ کے زیر اثر آنے کے بغیر یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی

☆ 8 DALBY AVE BRAD FORD BD 3, 7LW U.K.

رہتی ہے۔(۲)

غوری صاحب لکھتے ہیں:

’’یہ ایرانی زروانیت تھی، جس کی علامہ اقبال نے تقلید کی، سب سے پہلے انہوں نے ’’اسرار خودی‘‘ میں اس کا افتتاح کیا کہ یہ سارا ہنگامہ شہود اسرار وقت کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، اس کے بعد وقت کے ساتھ ان کا یہ غلو واغراق شدید سے شدید تر ہوتا گیا، ۱۹۲۲ء میں ’’پیام مشرق‘‘ شایع ہوئی تو انہوں نے اس میں زمانہ کی پراسرار حقیقت کا بیان کیا، ۱۹۲۷-۱۹۳۰ء کا وقفہ ’’خطبات‘‘ کی تدوین کا زمانہ ہے جو علامہ کے سنجیدہ منطقی افکار پر مشتمل ہیں، یہاں وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ زمانہ کو مبدأ اولین کائنات بتاتے ہیں، یہی نہیں بلکہ مصر ہیں کہ یہی قرآن حکیم کی تعلیم بھی ہے‘‘۔

فرماتے ہیں:

’’زمانہ کو جب تقدیر کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو وہ ماہیت اشیا بن جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے، ۱۹۳۲ء میں ’’جاوید نامہ‘‘ شایع ہوئی یہاں روح زمان اپنے اصلی نام ’’زروان‘‘ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، علامہ اسی زروان کی زبان سے کہلاتے ہیں کہ میں ہی مبدأ اولین ہوں، ۱۹۳۵ء میں ’’بال جبریل‘‘ منظر عام پر آئی، اس کی ایک اہم نظم ’’مسجد قرطبہ‘‘ ہے، جس کا افتتاح ہی اسی ’’زروانی دہریت‘‘ سے ہوتا ہے، فرماتے ہیں، سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات، غرض زمانہ یا دہر کے ’’مبدأ اولین کائنات‘‘ ہونے کا عقیدہ آخر تک ان کے دل و دماغ پر چھایا رہا‘‘۔

وہ لکھتے ہیں:

’’بدقسمتی سے ان کی اس بے راہ روی پر کسی جانب سے بھی گرفت نہیں ہوئی اور بدعقیدگی ان کے مزاج میں راسخ سے راسخ تر ہوتی گئی‘‘۔(۳)

اقبال اور ابن عربیؒ اور مسئلۂ تقدیر

علامہ اقبال نے تقدیر کی جو تعریف کی اور وقت کو جو

تقدیر قرار دیا، راقم السطور کی تحقیق کے مطابق وہ اشپنگلر کی بجائے حضرت امام محی الدین ابن العربیؒ کی عرفانی فکر سے ماخوذ ہے، جو غوری صاحب اور شارحین اقبال کے لیے تعجب کی بات ہوگی، راقم پہلے تقدیر اور زمان کے ربط کو علامہ کے انگریزی خطبات کی روشنی میں بیان کرے گا پھر حضرت ابن العربیؒ نے اس کے متعلق فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اسے احاطۂ تحریر میں لائے گا۔

حضرت علامہ اقبال خطبۂ دوم میں لکھتے ہیں:

’’انائے بصیر گویا انائے افعال کا مصلح ہے کیوں کہ وہ زمان و مکان کی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں یعنی ہر ’’آن‘‘ و ’’این‘‘ کو جو انائے افعال کے لیے ناگزیر ہیں ایک کل میں سمو دیتا ہے اور پھر یہی کل ہے، جس کو ہم شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا زمان خالص جیسا کہ عمیق تر تجزیے سے انکشاف ہوتا ہے، الگ تھلگ اور رجعت ناپذیر آنات کا کوئی سلسلہ نہیں، بلکہ ایک ’’نامی کل‘‘ جس میں ماضی پیچھے نہیں رہتا بلکہ ’’حال‘‘ میں کام کرتا ہے اور اس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، نہ مستقبل کوئی منزل ہے جسے طے کرنا ابھی باقی ہے اور جس کو اس لیے ہم اپنے سامنے موجود پاتے ہیں، ہم اسے موجود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ ایک غیر معین امکان ہے، چنانچہ بہ طور ایک ’’نامی کل‘‘ زمانے کا یہی تصور جس کو قرآن پاک نے ’’تقدیر‘‘ سے تعبیر کیا ہے لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک ٹھیک سمجھ سکی نہ غیر اسلامی دنیا، دراصل تقدیر عبارت ہے، اس زمانے سے جس کے امکانات کا انکشاف ابھی باقی ہے، یہ گویا وہ زمانہ ہے جو علت و معلول کی ترتیب سے آزاد ہے‘‘۔(۴)

’’لہٰذا بہ حیثیت تقدیر زمانہ ہی ہر شے کا جوہر ہے، قرآن پاک کا بھی ارشاد ہے کہ ہمیں نے ہر شے پیدا کی اور ہمیں نے اس کا اندازہ یا تقدیر یا مستقبل مقرر کیا لیکن کسی شے کی ’’تقدیر‘‘ قسمت کا وہ بے رحم ہاتھ نہیں جو ایک سخت گیر آقا کی طرح خارج سے کام کر رہا ہے بلکہ یہ ہر شے کی حد وسع ہے‘‘۔(۵)

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا اقتباسات سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

وقت ایک عضویاتی کل ہے،جس کے اندر مستقبل ایک مضمر ایک کھلا ہوا امکان زمان کی نوعیت میں موجود ہے،اسی کو قرآن مجید نے تقدیر کہا ہے،تقدیر دراصل وقت ہی کا نام ہے جس کے امکانات ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں،یہ کسی شے کی باطنی رسائی یا حدوسع سے عبارت ہے اور وہ امکانات ہیں جو فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں،معنی یہ نکلے کہ تقدیر اپنے امکانات کو منظر عام پر لانے کے پہلے کا تصور زمان ہے۔

تقدیر کا مفہوم ابن عربی کے نزدیک

ابن عربی کے نزدیک تقدیر اور وقت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے چنانچہ فتوحات مکیہ جلد اول فصل فی الاوقات میں بڑی گہرائی و گیرائی سے وقت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فنقول الوقت عبارة عن التقدير فی الامر الذی لا یقبل وجود عین مایقدر وهو الفرض "۔(۶)

پس جب ہم کہتے ہیں کہ وقت تقدیر سے عبارت ہے تو اس امر میں وہ وجود عین کو قبول نہیں کرتا اور جو اس میں فرض ہوئے ہیں وہ فرض ہیں۔

شیخ کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ جب وقت تقدیر سے عبارت ہو تو وہ اس امر میں وجود خارجی کو قبول نہیں کرتا جو کچھ وقت میں مقدر ہو وہ فرض ہے اور فرض کی ہوئی چیزوں کا وجود خارج میں نہیں ہوتا،لہٰذا تقدیر و وقت دونوں کا تعلق داخلی امکانات سے ہے۔

شیخ اکبر امام محی الدین ابن عربی فصوص الحکم، فص عزیزیہ میں فرماتے ہیں:

"قضا و قدر کا تعلق اعیان ثابتہ کی ان قبل از وجود (انکشاف سے پہلے) حقیقتوں سے ہے،جو باری تعالیٰ کے علم میں ثابت ہیں،اب اشیا کے بے کم و کاست واقعی خصوصیات کو اشیا کے لیے علم میں مقرر کردینا اشیا کی تقدیر ہے، تقدیر کے مطابق اشیا پر احکام کو نافذ کرنا قضا ہے"۔(۷)

ابن العربی اور علامہ دونوں کے نزدیک تقدیر کسی شے کی باطنی رسائی یا حدوسع ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارادۂ ذاتیہ ہے جو مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

ہمارے خیالات کے مطابق "انائے اعلا" کی تخلیقی سرگرمیوں سے جو مراد لیتے ہیں،وہ زمان و مکان ہیں،زمان و مکان دراصل اس انائے اعلا (نہائی حقیقت) کی امکانی صورتیں ہیں

جو صرف اور صرف ٹکڑوں میں ہیں، اس ذات حقیقی سے ماورا اور اس کی تخلیقی سرگرمیوں سے علاحدہ کوئی زمان و مکان نہیں۔(۸)

گویا کہ علامہ موصوف کے نزدیک زمان و مکان صفات الٰہی اور ارادۂ الٰہی ہے۔

اس سے پہلے کی تقدیر و وقت کے ربط کے تعلق سے علامہ کے خطبات سے جو عبارتیں پیش کی گئیں تھیں،اب ان کی مزید توضیح پیش خدمت ہے۔

"اقبال کا خیال ہے تقدیر کا ذکر جہاں قرآن پاک میں ہوا ہے،اس کا تعلق وقت یا مجموعی وقت سے ہے،وقت کے تین حصے ہیں،ماضی،حال،مستقبل،کیا آپ ماضی کو سچ مچ پیچھے چھوڑ سکتے ہیں،وقت ایک جاری ندی ہے جو ماضی کو حال تک پہنچاتی ہے اور پھر حال کے ساتھ مستقبل کی طرف جاتی ہے،مستقبل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسے ایک طے کیے جانے والا فاصلہ جس کو ابھی طے کرنا ہو،بلکہ وہ ایک کھلا امکان ہے اور جب قرآن پاک کہتا ہے،خدا نے سب چیزیں پیدا کیں اور ہر ایک کو اپنی تقدیر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مستقبل اس کے لیے مقرر کیا جو ایک امکان ہے اور جو اس چیز کی ذاتی قابلیتوں اور ممکنات پر منحصر ہے، مستقبل سے مراد واقعات کے وہ سربمہر پارسل نہیں ہیں جو وقت کے بطن میں خوابیدہ ہیں اور جو مقررہ ساعت پر معرض وجود میں آجاتے ہیں۔

مثلاً تقسیم ہند کو لیجیے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا، پاکستان ایک صندوق میں بند تحفہ نہیں تھا جو چودہ اگست کو کھولا گیا، بلکہ اس کے بننے میں ایک طرف مسلم لیگ تھی اور دوسری طرف کانگریس، انگریز تیسری جانب، مختلف قومیں ایک دوسرے کو آزماتی رہیں اور واقعات کو بناتی بگاڑتی رہیں اور گورداس پور کا ضلع دیکھیے کہ کبھی صندوق کے اندر ہوتا ہے اور کبھی صندوق کے باہر، ہمارے روزمرہ کام بھی مشین کی طرح نہیں ہوتے، اغراض و مقاصد کے تانے بانے سے بنے ہوتے ہیں اور یہی مقصد یا ارادے کا عنصر ہمارے حال کو مستقبل کی طرف لے جاتا ہے اور اگر یہ سب چیزیں پہلے طے ہوگئی ہوتیں تو ہمیں فوج رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پولیس کی کیا ضرورت تھی؟ جسے قتل ہونا تھا ہو جاتا،جس کی قسمت میں چوری ہوتی ہو جاتی اور پھر خدا نے انسان کو قرآن پاک کے مطابق ایک ذمہ دار شخصیت ٹھہرایا ہے،جو اپنے افعال کی مختار ہے وہ کسی اور کا بوجھ

نہیں اٹھاتا، صرف اپنے کیے کا بوجھ ہی اٹھاتا ہے، ''لا تزر وازرة وزر اخرى'' فرشتوں کے اعتراض کے باوجود انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا اور ان سے کہا میں تم سے بہتر جانتا ہوں، اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ میں تماشا دیکھنا چاہتا ہوں، اگر چہ تماشا ضرور رہتا ہے اور پھر ایک امانت اس کے سپرد کی، جس کے اٹھانے سے آسمانوں نے، زمینوں نے، پہاڑوں نے ڈر کر انکار کیا تھا، مگر انسان نے کہا کہ میں اس کا تحمل کروں گا اور انسان نے اپنے اوپر ظلم کیا، یہ خدا اپنی زبان سے کہتا ہے، اب بتائیے کہ مجبوری کہاں سے آگئی، اختیاری معاملہ تھا اور یہ نہیں کہا کہ وہ کیا امانت تھی؟ مگر یقیناً وہ شخصیت کی امانت ہوگی جس کے لیے ایک اندرونی چیز کا ہونا ضروری تھا، جس کو آپ قلب یا ضمیر یا روح کہتے ہیں۔

لوگوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے؟ بتایا گیا ''الروح من امر ربی'' روح خدا کے امر سے ہے، اقبال نے امر اور خلق میں فرق دکھایا ہے، باقی ساری چیزیں اللہ نے خلق کی ہیں صرف روح اس کے امر سے ہے، اس لیے اس کا کام بھی امر کرنا ہے یا رہنمائی ہے گویا قرآن کی ساری تعلیم خود اختیاری سکھاتی ہے اور جبر کے منافی ہے''۔(۹)

حقیقت مطلقہ اور اقبال محترم غوری صاحب نے اپنے مقالے ''اقبال کے تصورِ زمان'' میں کہیں لکھا ہے کہ اقبال زمان کو حقیقت مطلقہ کہتے ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ ان کی یہ لے دھیمی پڑ گئی تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے علامہ کے خطبات کی روشنی میں اس کے متعلق علامہ اقبال کا اصل موقف بیان کردیا جائے، وہ ''اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو'' میں لکھتے ہیں:

''میری اپنی رائے تو یہی ہے کہ زمانہ ''حقیقت مطلقہ'' کا ایک جز لاینفک ہے لیکن حقیقی زمانہ زمانِ متسلسل نہیں جس میں ماضی اور حال اور مستقبل کا امتیاز ناگزیر ہے، ہم اس کو استدام محض، یعنی بے تغیر ٹھہرائیں گے جس سے میک ٹیگرٹ کی دلیل کو دور کا بھی تعلق نہیں، پھر زمانِ متسلسل بھی تو دراصل استدام محض ہے جس کو فکر پارہ پارہ کردیتا ہے گویہ بھی ایک حیلہ ہے جس کے ذریعے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ کی تخلیقی فعالیت کا احصا جس کا سلسلہ پیہم جاری ہے، مقداری طور پر کرسکیں، قرآن پاک کے اس ارشاد ''واختلاف الليل والنهار'' یعنی رات دن کے اختلاف میں بھی میرے نزدیک یہی حقیقت پیش نظر ہے''۔(۱۰)

غوری صاحب کا یہ فرمانا کہ کبھی اقبال تقدیر کو زمانہ قرار دیتے ہیں اور کبھی زمان کو تقدیر بتاتے ہیں، اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر وہ غور و فکر سے کام لیں تو انہیں اقبال کی حقیقی فکر کا سراغ مل جائے گا، تقدیر زمانہ ہے یا زمانہ تقدیر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر تو خدا تعالیٰ کے ارادۂ ذاتیہ کا نام ہے، اس کے مطابق معلوم ہوگیا کہ زمان بھی بہ قول علامہ اقبال کے ارادۂ الٰہی کا نام ہے، گویا کہ زمان بھی مخلوق ہے جو کہ حقیقت مطلقہ کی تخلیقی فعالیت کا نتیجہ ہے۔

جان دار مخلوقات میں وحدت اسلام کی رو سے کائنات کی جزئیات میں مفرد ذرے سے لے کر مرکب حیات کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ طبقوں میں وحدت موجود ہے، اس زمین میں دھڑکنے والی زندگی ایک ہی جڑ سے نکلی ہے اور اس کی ہر شکل و صورت اسی ایک مادے پر مشتمل ہے اور وہ مادہ پانی ہے جو سب جان داروں کی اصل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا''۔(الانبیاء: آیت نمبر ۳۰)

اور جان داروں میں جوڑا جوڑا ہونے کی خاصیت مشترک ہے، چنانچہ فرمایا ''پاک ہے وہ اللہ جس نے زمین سے نکلنے والی چیزوں کے جوڑے پیدا کیے اور انسانوں کے بھی جوڑے بنائے اور بے شمار ان چیزوں کے بھی جن کو یہ لوگ جانتے نہیں'' (یٰسین: آیت نمبر ۳۶)، ''وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تم میں سے تمہارے لیے جوڑے بنائے اور جانوروں کے بھی جوڑے بنائے''۔(الشوریٰ: آیت نمبر ۱۱) اور جان داروں کی ہر ہر قسم میں اجتماعی تنظیم مشترک ہوتی ہے، قرآن پاک کہتا ہے ''اور زمین میں جس قدر چلنے والے جانور ہیں اور جس قدر پروں سے اڑنے والے پرندے ہیں، یہ سب تمہاری ہی طرح جماعتیں ہیں''۔(الانعام: آیت نمبر ۳۸)

اس طرح زمین میں سب جان داروں کے اندر تعلقات قایم ہوجاتے ہیں اور یہ سب ایک خاندان بن جاتے ہیں، یہ خاندان ایک ہی جڑ سے نکلا ہے گویا اعلا درجے کے جان دار جو ایک ہی قسم کی خصوصیتیں رکھتے ہیں، ان میں قرابت قایم ہوجاتی ہے۔

انسانی ابتدا کی یکسانی انسان جو حیات کا اعلا ترین نمونہ ہے، اس کا وجود کائنات کے اولین مادے سے بنایا گیا، اس مادے کے ساتھ انسان کا نہایت گہرا تعلق ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

''اور بلاشبہ ہم نے انسان کو کیچڑ کے خلاصے سے پیدا کیا''۔(المومنون: آیت نمبر ۱۲)

اس اصل واحد کے باعث اس کے افراد باہم مربوط ہیں، سب کی نسبت اس کے اصل کے ساتھ برابر ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے''۔ (مسلم وابوداؤد)

جنس انسانی کے تمام افراد ایک ہی جان سے پیدا کیے گئے تھے، اس جان سے ہی اس کا جوڑا بنایا گیا اور پھر تمام افراد انسانی ان دونوں سے پیدا ہوئے تھے، ارشاد خداوندی ہے کہ ''اے انسانو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مرد عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے''۔ (النساء: آیت نمبر ۱)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس آیت میں حیاتی وحدت کی طرف اشارہ ہے گویا کہ قرآن مجید یہ اشارہ دے رہا ہے کہ زندگی کا ادراک ایک وحدت نامیہ کی حیثیت سے ہونا چاہیے، سعدی شیرازی کہتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یک دیگراند که در آفرینش ز یک جوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوها را نماند قرار

انسانوں کی اقسام تعارف و واقفیت کے لیے ہے نہ کہ جدائی اور قطع تعلق کے لیے، ارشاد ہے ''اے انسانو! یقیناً ہم نے تمہیں مرد و عورت کی صورت میں پیدا کیا اور تمہاری شاخیں (گوتیں) اور قبیلے بنائے، تاکہ باہم تعارف کرسکو''۔ (الحجرات: آیت نمبر ۱۳)

اسلام وحدت انسانیت اور اجناس و قبایل کے اختلاف کی غرض و غایت بیان کر کے نسلی و جسی نزاع کے تمام اسباب کو زایل کر دیتا ہے اور یہ واضح کر دیتا ہے کہ مختلف نسلیں اور قبیلے اختلاف و تفریق کے بجائے باہمی تعارف و الفت کے لیے ہیں۔

خدائے واحد نے اس بشریت واحدہ کی طرف ایک ہی پیغام بھیجا جس پر ایمان لانے والے ایک امت ہیں، ارشاد باری ہے، ''اللہ نے تمہارے لیے وہ دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا تھا، اے پیغمبرؐ! اسی کو آپ کی طرف وحی کیا اور اس کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دیا کہ اسی دین کو قایم کرو اور اس میں جدائی مت ڈالو''۔ (الشوریٰ: آیت نمبر ۱۳)

سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے، ''تم کہو کہ اللہ پر ایمان لائے اور جو تعلیم

ہم پر اتاری گئی، اسے تسلیم کیا اور جو دین ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا، اسے مانا اور جو احکام موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے بھیجے گئے، ان پر ایمان لائے، ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے مطیع ہیں''۔

اسی طرح سورۃ المومنون آیت نمبر ۵۲-۵۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

''اے پیغمبر! پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور نیک اعمال اختیار کرو، یقیناً میں تمہارے اعمال سے باخبر ہوں اور بلاشبہ یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو تم صرف مجھ سے ڈرو''۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اللہ ہی کی طرف سے ہے اور وہ ایک دین ہے کہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے بغیر صرف اس کے سامنے گردن جھکائی جائے، قرآن پاک کی اس دعوت نے دینی نزاع کے تمام اسباب کو دور کر دیا، خدائے واحد کی عبادت و عبودیت کے دائرے میں سارے دنیوی و اخروی امور و معاملات شامل ہیں، اسلام اس وحدت کبریٰ کے تصور کو ثابت و راسخ کرنے کے لیے کچھ اور اقدامات بھی کرتا ہے تاکہ یہ وحدت انسانی ضمیر اور اس کے اندرون میں سرایت کر جائے اور اس کے جسم و جان کی تمنا اور روح کی آرزو بن جائے (۱۱)، مشہور حدیث الخلق عیال اللہ ''تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے'' میں بھی وحدت انسانی کا تصور نظر آتا ہے۔ (۱۲)

طلسم زمان کی شکست

مقالہ نگار کو معلوم نہیں کہ علامہ اقبال نے جہاں ''زرتشتی رمز میں زروان'' کی اصطلاح استعمال کی ہے، وہاں اس کے جبر کو شکست سے بھی دوچار کیا ہے، ان کی فکر کو ''زروانی'' قرار دینا غلط ہے، یہ تو دراصل اسلام کے عرفانی ادب کا شاہکار ہے، اس کے نتایج ملاحظہ ہوں۔

عالم مادی پر زمانہ سوار ہوتا ہے اور انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ زمانے کا راکب بن جائے، زمانے کا راکب بننا ہی زمانے کو شکست دینا ہے، علامہ اقبال نے اس امر کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے، جن نظموں میں بہ ظاہر زمانے کی قدرت اور طاقت کا گمان ہوتا ہے ان میں بھی یہی حقیقت کارفرما ہوتی ہے، مثلاً ''نوائے وقت'' کا یہی پیغام ہے۔

من نگری ہیچم ، در خود نگری جانم
از موج بلند تو سر برزدہ طوفانم

وقت کا طوفان خودی کے سمندر سے ابھرتا ہے، خودی اس پر قابو نہ پاسکے تو تباہی کا پیامبر ہے، ورنہ یہ امکانات کے اظہار کا وسیلہ، ترقی پذیر انسانیت ہمیشہ راکب تقدیر ہے، راکب تقدیر بندۂ حُر ہے، اسرار خودی کی معرکۃ الآرا اور الجھن میں ڈال دینے والی وہ منزل ہے جہاں اقبال تکمیل خودی کی منزل مستقبل کے انسان یا ایک نئی انسانی نوع کو قرار دیتا ہے، اسی منزل پر وقت کا مسئلہ بھی مرکزی اہمیت اختیار کر لیتا ہے، نظم کے آغاز پر ہی اقبال نے اعلان کیا تھا کہ ارتقا کی اگلی منزل اعلا خودی کا عروج ہے۔

وسعت ایام جولانگاہ او آسماں موجے زگرد راہ او

یہ مستقبلی انسان جو نیابت الٰہی کا بوجھ سنبھالنے والا ہے، راکب تقدیر ہے، یہ شہوار اشہب دوراں ہے، جس کا انسانیت بے تابی سے انتظار کر رہی ہے، کیوں کہ یہی ''فروغ دیدۂ امکان'' بھی ہے، یہ زمانے میں رہتے ہوئے زمانے پر فتح حاصل کرتا ہے، جس کا مطلب عام کائناتی وقت سے آزادی اور دوران خالص کا سرور ہے، کائناتی وقت برگساں اور اقبال دونوں کے نزدیک مکانی ہے اور اسی لیے اقبال آگاہ کرتا ہے کہ اصلی وقت یا دوران کو خط سے ممتاز کیا جائے جہاں دوران خالص مرد حر کا امتیاز ہے، وہیں مکانی زمان کی قید عبد یا محکوم کی نشانی ہے یہ وہی نکتہ ہے جس پر برگساں نے اپنی کتاب ''وقت اور آزادارادہ'' میں زور دیا تھا، لیکن فرق یہ ہے کہ برگساں کے برخلاف اقبال کا بنیادی محرک مذہبی ہے، ان کا مرد حر، پیغمبرانہ صفات کا حامل ہے اور موسیٰ اور محمد ﷺ کی روایات کا علم بردار ہے، اقبال کا یہ محرک اس سے نمایاں ہوجاتا ہے کہ نوع انسانی خدائے حی و قیوم سے اسی طرح آگاہ ہوجائے، جس طرح موسیٰ و محمد مصطفیٰ ﷺ نے یہ شرف حاصل کیا تھا اور اسی سے برگساں کے خالص نقطہ نظر سے اقبال کا راستہ مختلف ہوجاتا ہے جو دوران خالص کے سرور سے آگاہ نہیں، اس کے نصیب میں سرچشمۂ حیات ابدی کا سرور نہیں تھا، کیوں کہ اس سے وہی سرور اور سرشار ہوسکتا ہے جو ''لی مع اللہ وقت'' کہنے کی قدرت رکھتا ہو، اسرار خودی کے انگریزی مترجم نکلسن نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے کہ آیا پیغمبر کا یہ تجربہ

''لی مع اللہ وقت'' لازمانیت کا تجربہ تھا، اس سے ہم روحانی تجربہ کو اقبال زمان ولازمان کے قدیم تضادات کی زبان میں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کیوں کہ ''لازمان'' محض زمان کی نفی ہے جس سے کسی عالم کی ہمیں خبر نہیں ملتی۔

اصل سوال یہ ہے کہ اس ''عالم'' کی سیر ''زمانے'' سے کس انداز سے باہر ہوتی ہے، اگر زمانے سے مراد ''دوش و فردا'' کا وقت اور امتیاز ہے تو یقیناً یہ ''سیر'' زمانے سے باہر ہے لیکن اگر یہ سیر اس حال میں ہوئی ہے جس کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا گیا تو پھر ''زمان'' اور ''لازمان'' کی تضادی اصطلاحوں کا اس تجربہ پر اطلاق نہیں ہوتا۔

اقبال کے نقطہ نظر سے نفس انسانی، کائناتی وقت کے سلسلے سے آزاد ہوکر دوران خالص کا سرور حاصل کرتا ہے اور اس ''شعور'' سے مستفیض ہوتا ہے، جس کی خصوصیت اقبال کے نزدیک زمان بغیر تواتر یا تغیر بغیر تواتر ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے اس مقام پر آزادی کا ایک مابعد الطبیعاتی روحانی معیار مقرر کرنے کی کوشش کی ہے اور آزادی اور اسیری یا محکومیت کے عمرانی مفاہیم بھی اسی مابعد الطبیعاتی روحانی معیار سے متعین ہوتے ہیں (یہی اسرار و رموز کا اندرونی ربط بھی ہے)، وہ جس نے اپنے روحانی تجربے میں دوران خالص یا تغیر بغیر تواتر کا سرور حاصل کیا اس نے ''پہلے'' اور ''بعد'' کے کائناتی وقت سے آزادی حاصل کی اور صحیح معنوں میں بندۂ حُر بنا، یہی بندۂ حر زندگی کی دوسری سطحوں میں بھی اپنی آزادی برقرار رکھ سکتا ہے، سیاسی آزادی اور روحانی آزادی، دو غیر متعلق امور نہیں ہیں بلکہ ان میں اندرونی ربط ہے (یہاں بھی اقبال بیسویں صدی کی خالص سیکولر فکر سے اپنا راستہ الگ کرلیتے ہیں)، مرد حر زمان حقیقی اور کائناتی وقت میں امتیاز کرتا ہے۔ آزاد عمل جدید سے جدید تر کی تخلیق کا نام ہے (دمبدم نوآفرینی کار حر) جو عبد کے بس کی بات نہیں کیوں کہ وہ اسیر ایام ہے۔

لیکن یہاں اس نکتہ سے آگاہی ضروری ہے کہ زمان حقیقی کا شعور دوسرے الفاظ میں شکست زمان پر قدرت کا نتیجہ ہے جہاں ''زمان'' سے مراد محض کائناتی وقت ہے، اسی حقیقت کا اظہار جسے ''جواب شکوہ'' میں خطیبانہ انداز میں بیان کیا گیا تھا، یہاں زیادہ گہرے فلسفیانہ انداز

میں کیا گیا ہے، تاریخ روایتی معنی میں محض ''تقدیر'' ہے، اگر اس میں تاریخ کے کردار، مکان سے مقید زمان میں اسیر رہتے ہیں اور تاریخ تقدیر کی تشکیل ہے اگر یہی کردار زمانِ حقیقی یا دوراں کے سرور سے آگاہ ہوجائیں، بات بہ ظاہر مابعد الطبیعاتی نظر آتی ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو اس میں ایک اہم حقیقت پوشیدہ ہے، سوئی ہوئی قومیں اور افراد عالم مادی کی اشیا کی طرح علل و معلول کے رشتے میں اسیر رہتے ہیں، جن پر ان کو قابو نہیں رہتا لیکن حقیقی عالم انسان میں رہنے والے جہاں اس علل و معلول کے ربط سے کلیتاً آزاد نہیں ہوتے وہاں ان کا آزاد ارادہ خود سلسلۂ علل میں ایک علت بن جاتا ہے اور اس طرح علل کے اس سلسلے کی نوعیت بدل جاتی ہے، یہاں تک تو اقبال نیطشے سے متفق ہیں لیکن اقبال ارادے کی آزادی محض پر قانع نہیں رہتے بلکہ وہ اس بات پر بھی مصر رہتے ہیں کہ یہ آزاد ارادہ اس دورانِ خالص کے سرور سے بھی مستفیض ہو، جس سے آزادیٔ مطلق عبارت ہے جو خودیٔ مطلق کے لیے مخصوص ہے۔

یہاں اقبال نے دراصل مذہبی روحانی تجربے کی ماہیت یا اس کے متن کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو دوسرے لفظوں میں اعلا روحانی تجربہ محض سلبی انداز میں لازمی نہیں ہے بلکہ زمان و لازماں سے بلند، دورانِ خالص یا تغیر بغیر تواتر کی ''سیر'' ہے دورانِ خالص صرف ایک ذات کی کیفیت ہوسکتی ہے، اس لیے اس کا سرور بھی دوسرے اعتبار سے ذات کا سرور ہے۔

''فان الدھر ھو اللّٰہ'' پر استغراق نے اقبال کو ''زروانیت'' کی جانب نہیں بھٹکایا بلکہ اس اعلاترین تجربے کی طرف رہنمائی کی جو تمام عارفوں کا منتہائے نظر رہا ہے، ''لی مع اللّٰہ وقت'' کی تکرار، اسرار کو جاوید نامے سے مربوط کرتی ہے، جہاں ''لی مع اللّٰہ'' کا تجربہ ''زروان'' کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے، ''جاوید نامہ'' میں زروان ایک وجود کی حیثیت سے داخل نہیں ہوتا بلکہ اس زماں بستہ و مکاں بستہ عالم کے رمز کے طور پر استعمال ہوا ہے، جہاں ''جبر'' کی حکم رانی ہے اور ''وقت'' مکان کی طرح ایک رکاوٹ ہے اسی عالم فطرت میں جو زمانی مکانی ہے، علت کے قانون کی حکم رانی ہے اور انسان دوسری مخلوقات کی طرح غیر شخصی قوانین فطرت کے تحت عمل کرنے پر مجبور ہے یہیں وقت کا جبر نمایاں ہوتا ہے اور وقت ایک قہر بن کر بھی نازل ہوتا ہے، زرتشتی رمز میں زروان اسی کائناتی وقت کی روح یا اس کا فرشتہ ہے اور اسی لیے اس کا کلام وجود کی اسی سطح پر

معنویت رکھتا ہے، جہاں زمان مکان سے وابستہ ہے اور مادی کائنات کا چوتھا بعد ہے، یہ عالم جبر ہے جہاں پیدایش اور نمو دونوں قانون جبر کے تابع ہیں لیکن شعور کی ایسی منزلیں بھی ممکن ہیں جہاں زمان مکان سے آزادی حاصل کرتا ہے اور بالآخر مکان سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

''لی مع اللّٰہ وقت'' کا ''وقت'' شعور کی وہ اعلا منزل ہے جو صرف اس ''عبد'' کے لیے مخصوص ہے جو مکان سے کامل طور پر رشتہ توڑ سکتا ہے اور اسی لیے ملایکہ مقربین بھی اس ''فیض'' سے محروم رہتے ہیں، یہاں ''وقت'' کی بجائے مکان یا محل رکھ دیجیے اور تعبد لازم آئے گا، اس لمحۂ غیر زمانی میں جس سے اس حدیث کا وقت عبارت ہے، زروان کے پر کٹ جاتے ہیں:

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست   آں جواں مردے طلسم من شکست

گر تو خواہی من نباشم درمیان   لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

یہ منزل تقدیر پر آخری فتح کی منزل ہے اور یہی تقدیر پر فتح اقبال کے نزدیک ''زادنِ نو'' ہے اور یہ ''زادنِ نو'' شرط ہے شعور کے اس انقلاب کے لیے جو انسانی زیست کا منتہا ہے اور ذات محمد ﷺ کا اعلا تجربہ، یہ نمو کی اعلاترین مثال ہے، جہاں نزد و دور بے معنی ہوجاتے ہیں اور ''ابد'' اور ''زمان'' کا فرق اضافی ہوجاتا ہے کیوں کہ ''ابد'' زمان کو اپنے اندر سمو لیتا ہے، طلسم زمان کی شکست میں زمان کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے، اقبال کے شاعرانہ وجدان کی یہ منزل اسلام کے عارفانہ و حکیمانہ ادب میں منفرد مقام ہے۔ (۱۳)

بیسویں صدی کے سیکولر فکر میں زروانیت کا احیا ہوا تو تقریباً سارے جبری فلسفوں میں مانی کے قدیم مسلک اور زروانیت کی جھلک نظر آتی ہے، اسی لیے بعض مذہب کی طرف مائل نقادوں کو جہاں بھی وقت اور زمان کے مسئلے سے سنجیدہ دلچسپی دکھائی دیتی ہے وہاں انہیں زروانیت کے گہرے سائے نظر آتے ہیں، اس بنا پر بعض نقادوں نے اقبال کی شاعرانہ فکر کا رشتہ بھی زروانیت سے جوڑ دیا، اس قسم کی مذہبی احتیاط کو بے جا تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اقبال کی حد تک یہ بے محل ضرور ہے۔

حافظ حدیث عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ (م ۴۶۵ھ) کا مرتبہ حدیث میں اہل علم سے مخفی نہیں، اگر ان کے نزدیک ''لِی مَعَ اللّٰہِ وَقتٌ لَا یَسَعُ فِیہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرسَلٌ'' کی

حدیث صحیح نہ ہوتی تو وہ اسے نقل نہ کرتے (۱۴)۔ حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی (م ۹۰۲ھ) مذکورہ بالا حدیث کے متعلق فرماتے ہیں "صوفیہ اکثر اس حدیث کا ذکر کرتے ہیں، ممکن ہے اس کی روایت بالمعنی ہو جسے ترمذی نے شمائل میں اور ابن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آں حضرت ﷺ اپنے گھر تشریف لاتے تو گھر کے اوقات کو تقسیم فرماتے، ایک حصہ اللہ کے لیے، ایک گھر والوں کے لیے اور ایک اپنی ذات کے لیے، پھر اپنے حصے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے، ایک اپنے لیے اور ایک لوگوں کے لیے" (۱۵)۔ مفسر محدث شیخ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی (م ۱۱۶۲ھ) اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں "اکثر صوفیہ اس حدیث کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد وہ رسالہ قشیریہ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرتے ہیں"۔ (۱۶)

لآ لیؔ میں بھی اسے ذکر کرکے مزید یہ بھی تحریر کیا ہے کہ خطیب نے اس حدیث کو جس سند سے روایت کیا ہے، اس کے متعلق حافظ دمیاطی فرماتے ہیں کہ "اس کی سند صحیح حدیث جیسی ہے"، ملا علی قاری اسے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کو مراد لیا ہے"، وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں اس مقام استغراق کی طرف اشارہ ہے جسے سکر، محو اور فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ (۱۷)

غوری صاحب اپنے مقالے میں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں:

"بہر حال یہ علامہ کی فکری سرگرمیوں کا انتہائی اضطراب و کشمکش کا زمانہ ہے جس کے نتیجے میں وہ اور بھٹکتے گئے اور ان کے مزاج میں زروانیت پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی، ادھر علما بالخصوص ان کے فکری رہنما سید سلیمان ندوی مرحوم کی خاموشی سے ان کی "تجدید دہریت" کی سعی لاحاصل میں شدت پیدا ہوتی گئی، اسے مزید تقویت یورپی مفکرین کے مطالعے سے ملی جس کے توڑ کے لیے علمائے ہند نے اپنی ذمہ داری کو قطعاً محسوس نہیں کیا، حالانکہ ان ہی بزرگوں نے ان کی تصوف بالخصوص عقیدہ وحدت الوجود کی مخالفت پر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا مگر انہوں نے علامہ کی ان سنجیدہ بے راہ رویوں کو شاعرانہ خیال آفرینی سے زیادہ اہمیت نہیں دی، ادھر تعلیم یافتہ طبقے نے اسے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" سمجھ کر آمنا وصدقنا کہا جب کہ حقیقت میں اس کا اسلام سے دور کا تعلق نہ تھا اور یہ سب باتیں ان کی مغربی مصنفین کے طویل مطالعے کا کرشمہ تھیں"۔ (۱۸)

ناچیز راقم السطور "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" متعلق غوری صاحب کے ان اعتراضات سے قطعاً متفق نہیں ہے، اگر وہ علامہ کی اس کتاب کا مکمل مطالعہ غیر جانب دارانہ طور پر کرتے تو ہرگز یہ رائے نہ دیتے، بلاشبہ اسلام کے دینی تصور کو علامہ موصوف نے اس کتاب میں جدید سائنسی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر جس انداز سے ترتیب دیا، وہ اسی انداز کا ہے جو امام اشعری اور دیگر متکلمین اسلام نے اپنے اپنے دور میں سرانجام دیا تھا، علامہ کے اس کام کی جتنی داد دی جائے وہ کم ہے، مولانا سید سلیمان ندوی یا ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے گو علامہ کے بعض خیالات سے عدم اتفاق اور ان کے طریقہ تعبیر کی پیچیدگی کی طرف اشارہ کیا ہے مگر وہ ان کی نشان دہی نہیں کر سکے، خود غوری صاحب بھی بعض امور مثلاً تقدیر میں اصطلاحی پہلو کو بیان کرنے سے قاصر رہے، "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو" پر راقم کی بحث سے انشاء اللہ یہ امر کھل کر سامنے آجائے گا کہ علامہ موصوف کی توجہ تمام تر افکار دینی کی تشکیل نو پر تھی۔

اسلام اور مسلمانوں کا نقشۂ عمل

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) نے "اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو" میں نظریاتی حیثیت سے فلسفہ خودی پر بحث کی ہے، مگر اس کا براہ راست تعلق فلسفے سے نہیں ہے بلکہ ان خطبات کا تعلق "اسلام میں دینی فکر کی تعبیر نو" کی ترتیب سے ہے، اس لیے اس میں فلسفہ خودی یا نظریہ خودی کی تفصیل و تشریح مرتب طور پر موجود نہیں، اس کے علاوہ علامہ موصوف نے اس میں اپنے فلسفے کی تفصیل میں پڑنے کے بجائے اس کی تمہید ہی پر اکتفا کیا ہے۔

بلاشبہ علامہ کی شاعرانہ تصانیف حجم و کیفیت دونوں میں برتر ہونے اور شاعرانہ زبان اور "کثرت معانی و تعبیر" کی بنا پر ان کے فلسفے کی زیادہ موثر تفسیریں تو قرار دی جاسکتی ہیں مگر یہ ان کے فلسفے کا حصہ نہیں بن سکتیں، شاعری کے توسط سے کسی فلسفی شاعر کے نظام کو سمجھنے میں اس کے ظاہری تناقضات میں الجھنے اور گم ہو جانے کا اندیشہ بھی رہتا ہے جو فلسفیانہ فکر کے فروعی برگ و بار کہے جاسکتے ہیں، علامہ اقبال کے وہ تصورات جن میں مغربی فکر کی پرچھائیاں یا جن میں مغرب کے تہذیبی ورثے سے گریز کا پیغام ہے، ان کی شاعری میں پھیلے ہوئے ہیں، کہیں منضبط شکل میں جیسے اسرار خودی، رموز بے خودی، زبور عجم، جاوید نامہ اور گلشن راز جدید میں اور کہیں غیر منضبط شکل میں جیسے قطعات، غزلیات اور مختصر نظموں میں۔

اس کے برخلاف ''اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو'' میں ان عناصر کا خاکہ مل جاتا ہے جن سے وہ فکری سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک نقشۂ عمل بنانا چاہتے تھے، اس نقشۂ عمل کی تشکیل میں انہوں نے کسی جگہ بھی مغربی فکر اور اس کے چیلنج کو فراموش نہیں کیا ہے، انہوں نے مشرقی حکمت وتصوف اور مغربی فلسفہ وسائنس کی ساری ترقیات کو سامنے رکھ کر اور ان کے حوالے سے ''اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو'' کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کی جو ان کے خیال میں اسلام کا اولین، اصلی اور بنیادی تصور دین ہے، گویا کہ خطبات ایک کامل نظریہ حیات اور نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کا ایک حکیمانہ مطالعہ ہیں، اس میں دین کا وہ آفاقی نقطہ نظر پیش کیا گیا جو اسلام کی شکل میں تمام ادیان ومذاہب کی اصلی وفطری صورت ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، اس نے دنیا کے دوسرے موجود ادیان ومذاہب کے عقاید میں مرور وقت سے جن عناصر فطرت کی کمی ہوگئی تھی ان کی تکمیل اور صحیح راستے سے ہٹ جانے کی وجہ سے ان کے عقاید میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کر دینا لازمی تھا، اس صحیح راستے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو پہلے ہی عہد وپیماں کے ذریعہ دی تھی اور وہ اسی کی مدد اور توفیق سے اسے ملی تھی۔

خطبات میں ذکر کردہ افکار کا خاکہ

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی اور تصور حیات انسانی خالص اسلامی اساس پر مبنی ہے، اسی طرح ان کا فلسفہ مابعد الطبیعات بھی وحی والہام کا رہین منت ہے، ان کے نظام فکر کا ایک اہم ترین جز جس کا تعلق دین اسلام کے بنیادی عقاید سے ہے، یعنی وجود باری، توحید، رسالت، ختم نبوت، حشر ونشر، وحی والہام اور خیر وشر وغیرہ ان کو انہوں نے جہاں عقلی دلائل سے ثابت کیا وہاں بلاشبہ ''اتحاد عمل'' کا بھی لحاظ رکھا ہے اور فلسفہ کو دین کا آلہ کار نہیں بنایا بلکہ ان دونوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یورپ میں سب سے پہلے کانٹ نے ''مذہب'' کو فلسفہ کی گرفت سے آزاد کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا، اس لیے کہ اس کے نزدیک عقل محض مذہب کی گتھیوں کو سلجھانے سے قاصر ہے، مگر اقبال نے فلسفہ کو دین اسلام سے ملانے کی زبردست خدمت انجام دی ہے اور اسی بنیاد پر انہوں نے اپنے ''فلسفہ دینی'' کی تعمیر کی ہے۔

ایک طرف انہوں نے فلسفہ یونان پر سخت تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ تمام تر نظری ہے، اس لیے ''ناقابل عمل'' ہے اور دوسری طرف اس بات پر زور دیا کہ محض نظر وقیاس سے ''حقیقت کبریٰ'' (ULTIMATE REALITY) تک پہنچنا ناممکن ہے، اقبال نے وحی والہام، اسرار خودی، حقیقت کبریٰ اور بقا کے مسایل میں صوفیائے اسلام کا عرفانی مسلک اختیار کیا تاکہ وجود باری کو ثابت کیا جاسکے جو علامہ اقبال کے تمام فلسفہ کی بنیاد ہے۔

''خطبات'' کے خطبۂ اول ودوم میں اصل بحث ''علم'' کی ہے جس میں فکر اور وجدان کا جایزہ لیتے ہوئے ذات الٰہیہ کا اثبات کیا گیا ہے اور خطبۂ سوم وچہارم میں ذات الٰہیہ کے تصور، اس کی اہم صفات، انسان اور کائنات، حیات بعد الموت، دعا، خیر وشر اور جبر وقدر رایسے مسایل کی تشریح کی ہے جس کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ زمان ومکان کی اس دنیا میں زندگی کے بارے میں ہمارا مطمح نظر کیا ہے، لہٰذا اسلامی ثقافت اور اسلامی نظام مدنیت یا ریاست اور قانون کی بحث ناگزیر ہو گئی جس پر خطبۂ پنجم اور ششم مشتمل ہے۔

خطبۂ ہفتم میں یہ سارے مسایل پھر زندگی کا مسئلہ بن کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اس لیے کہ انسان اور انسان کے ساتھ ساتھ عالم انسانی کے ایک جز کی حیثیت سے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری اس عقلی کاوش یا پختگی ایمان کی جسے ہم فلسفہ اور مذہب سے تعبیر کرتے ہیں، کوئی حقیقت ہے یا کہ نہیں؟ ہماری تہذیب وتمدن کا مستقبل کیا ہے؟ ہماری تقدیر کیا ہے؟ جس میں ہم پھر فکر سے علم اور علم سے دین یعنی اسلام کی طرف آجاتے ہیں اور اس امر کا اقرار کیے بغیر نہیں رہتے کہ ہماری ذات کسی ایسی برتر اور وسیع تر ذات سے وابستہ ہے جس نے کائنات اور اس کے ذرے ذرے کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے، ارشاد ربانی ہے:

''وَهُوَ بِكُلِّ شَئٍ مُحِيطٌ'' اور وہ ہر شئے کو محیط ہے۔ (۱۹)

غوری صاحب فرماتے ہیں:

''مسئلہ زمان کا پہلی مرتبہ ذکر ''اسرار خودی'' میں ملتا ہے مگر چونکہ وہ اپنے لیے افرنگ زدگی کا طعنہ سننا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے برگسانی تصور کو جو حریت عمل کے فلسفے کی کلید تھا، اسلامی الاصل بتانے کے لیے امام شافعی کا مقولہ ''الوقت سیف'' سے ماخوذ قرار دیا''۔ (۲۰)

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ امام شافعیؒ کے مقولہ کی جھلک تصوف کے مشہور زمانہ رسالہ قشیریہ میں موجود ہے اور علامہ اقبال جاوید نامہ اور دیگر کتابوں میں زمانہ سے متعلق جو باتیں کہیں ہیں، وہی کشف المحجوب اور سید گیسو دراز نے شرح رسالہ قشیریہ میں کہی ہیں، اس لیے علامہ اپنے فکرو خیال میں منفرد نہیں ہیں بلکہ عالم اسلام کی بہت سی عبقری شخصیات کا بھی یہی نقطہ نظر ہے، غوری صاحب کو اس طرح کی باتیں لکھنے سے قبل ذرا ان کتابوں کا بھی مطالعہ کر لینا چاہیے تھا، ظاہر ہے کہ امام شافعیؒ کے مقولہ کی کوئی فلسفیانہ تعبیر تو ہونی چاہیے، ان کی اور امام قشیری اور سید گیسو دراز وغیرہ کی زمانہ کے تعلق سے اس طرح کی باتیں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس کا اسلامی فکر سے ضرور تعلق ہے اور "لا تسبوا الدھر" کی حدیث جو جوامع الکلم کے حامل نبیؐ کی زبان گہر بار سے نکلی ہے، ضرور اپنے اندر مقاصد چھپائے ہوئے ہے، رسول یا نبی کا کلام ہمیشہ اپنی امت کی رہبری کا سبب ہوتا ہے، آگے ہم اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے ان حضرات کے اقوال نقل کرتے ہیں:

مسئلہ زمان میں علمائے اسلام کی دل چسپی

امام عبدالکریم بن ہوازن قشیری (م ۴۶۵ھ) اپنے رسالہ قشیریہ میں "وقت" کے عنوان کو مستقل موضوع سخن بنا کر اس پر ایک طویل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صوفیا کے یہاں یوں بھی کہا جاتا ہے "الوقت سیف" (وقت تلوار ہے) یعنی جس طرح تلوار کاٹتی ہے اسی طرح ان امور کی وجہ سے جنھیں اللہ تعالیٰ جاری کرتا ہے غالب ہوتا ہے، بعض اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ تلوار چھونے میں نرم محسوس ہوتی ہے مگر اس کی دھار کاٹنے والی ہے لہٰذا جس نے اس سے نرمی کی وہ بچ گیا اور جس نے سختی کی وہ کٹ گیا، یہی حال وقت کا ہے، جس نے وقت کے سامنے سر جھکا دیا وہ نجات پا گیا اور جس نے مقابلہ کیا وہ سرنگوں اور تباہ ہوا، چنانچہ اس کی تائید میں یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

وکالسیف ان لاینتہ لان مسہ   وحداہ ان خاشنتہ خشنان

(ترجمہ) وقت کی مثال تلوار کی سی ہے اگر اس سے نرمی سے پیش آؤ گے تو وہ بھی نرم محسوس ہوگی اور اگر اس سے سختی کرو گے تو اس کی دونوں دھاریں سخت ہوں گی۔

لہٰذا جس شخص سے وقت نے مساعدت کی تو پھر وقت اس کا ہے، جس کے ساتھ وقت نے تنگی کی وقت اس کے لیے دشمنی کا سبب ہوگا، میں نے استاد ابو علی دقائق کو یوں فرماتے سنا ہے "وقت ریتی کی طرح ہے جو تجھے گھستا ہے مگر فنا نہیں کرتا، یعنی اگر تجھے فنا کر دے تو نجات پا جائے مگر وقت تمھیں گھٹاتا جاتا ہے اور کلیتاً مٹاتا نہیں"۔ (۲۱)

سید گیسو دراز چشتیؒ بندہ نواز اس کی شرح کرتے ہوئے رسالہ قشیریہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وقت انسان کو ایسے سمندر میں ڈبو دیتا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا، کہا گیا ہے کہ وقت تلوار ہے اور تلوار کی دو صفات ہیں، ایک نرم اور روشن دکھائی دیتی ہے جس میں صاف چیز نظر آتی ہے، جس پر چلنے سے پیر پھسلتے اور اس کو چھونے سے ہاتھ پھسلتے ہیں اور اس کی دوسری صفت اس کی تیزی اور کاٹنے والی ہوتی ہے سو جو اس کو نرمی کے ساتھ لیتا ہے وہ حفاظت میں رہتا ہے لیکن جو اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے وہ ہلاک اور ضائع ہو جاتا ہے"۔ (۲۲)

علامہ سید برکات احمد ٹونکی مرحوم اپنے رسالہ "اتقان العرفان فی ماھیۃ الزمان" میں لکھتے ہیں:

"زمان اور حرکت اپنے مبدع کے ہاتھ میں ہیں، یہ دونوں ممکن ہیں اور انھیں فاعل کی ضرورت ہے، زمان کا اثر اس باب میں بہت تھوڑا ہے اور وہ بھی نہایت ضعیف ہے اور اس کا وجود "غیر قار" ہے جو "وجود" کی ضعیف ترین شکل ہے، زمان "وجود مطلق" کا جو واجب الوجود ہے، ظل ہے اس لیے زمان کو اپنے مبدع سے ایک ایسا وجود عطا ہوا ہے جو زمانیت پر محیط ہے، جس طرح مبدع کا وجود تمام کائنات کو محیط ہے"۔ (۲۳)

علامہ تاج الدین محمود اشنوی اپنے رسالہ "غایۃ المکان فی معرفۃ الزمان" میں لکھتے ہیں:

"اور راقم الحروف کے نزدیک ایک بات یہ ہے کہ آسمان و زمین میں کوئی راز زمان و مکان کے اسرار سے زیادہ عزیز، زیادہ اہم اور زیادہ فائدہ مند

نہیں، اس لیے بیشتر اسرار جن کے بارے میں مشائخ طریقت اور علمائے حق نے لکھا ہے وہ حق تعالیٰ کے کاموں کے اسرار ہیں اور زمان و مکان اس کی ذات وصفات کے اسرار کو پہچانتا ہے اور جو شخص زمان و مکان کو نہیں جانتا اس کو خدا کی ذات وصفات کی معرفت کا زیادہ حصہ نہیں ملتا''۔(۲۴)

شیخ اکبر امام محی الدین ابن العربی نے مسئلہ زمان کے سلسلے میں مستقل دو کتابیں تالیف فرمائیں، ایک ''کتاب الزمان فی معرفة الدهر''، دوسری ''کتاب الشان''، علاوہ ازیں فتوحات مکیہ میں مختلف مقامات پر اس مسئلہ پر بحث کر کے اس کو حل کر دیا ہے، چنانچہ فتوحات مکیہ کے باب نمبر ۱۵ میں لکھتے ہیں:

''ایک قطب جو مداوی الکلم ہے، اس کا نام مستلم ہے، اس کی طبیعت پر زیادہ تر غلبہ ''علم زمان'' کا تھا، یہ بڑا شریف علم ہے، اس سے ازل کا علم پہچانا جاتا ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول واضح ہوتا ہے کہ ''کان اللہ ولم یکن معہٗ شئی'' اس علم کو لوگوں میں سے کوئی ہی فرد جانتا ہے''۔

آگے شیخ اکبر لکھتے ہیں:

''مداوی الکلم ہونے کی وجہ سے اس کو جو اسرار حاصل تھے اور اس سے جو علوم ظاہر ہوئے ان کے ظہور کے بعد پھر یہ حال مداوی الکلم کے ایک دوسرے شخص سے ظاہر ہوئے جس کا نام المستلم للقضاء والقدر ہے''۔(۲۵)

طوالت کے خوف سے راقم السطور نے علامہ اقبال کے انگریزی زبان کے خطبات کے متن نہیں دیے، علاوہ ازیں اب اردو میں اس پر اس قدر کام ہو چکا ہے کہ اصل متن کو نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی، صرف اس کی تفہیم کا کام باقی ہے، وہ بھی ان شاء اللہ ہو جائے گا۔

مراجع

(۱) سورۂ انفال، آیت نمبر ۵۳۔ (۲) مختار حق، محمد عالم، علامہ کے سفر کی روئیداد اور خطبات، بحوالہ نقوش، اقبال نمبر ۱، ج ۱، ص ۵۶۵، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۷ء۔ (۳) غوری، شبیر احمد، اقبال کا تصور زمان، بحوالہ نذر عابد،

ص ۲۷۱ و ۲۷۲، مطبوعہ دلی، ۱۹۷۴۔ (۴) اقبال، علامہ، ڈاکٹر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو ترجمہ، ص ۷۶، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸۔ (۵) ایضاً، ص ۷۷۔ (۶) ابن عربی، محی الدین، شیخ اکبر، فتوحات مکیہ، ج ۱، ص ۳۸۴، مطبوعہ دار صادر بیروت۔ (۷) ابن عربی، محی الدین، شیخ اکبر، فصوص الحکم فص عزیزیہ، اردو ترجمہ، مطبوعہ لاہور۔ (۸) اقبال، علامہ، ڈاکٹر، تفکر دینی پر تجدید نظر، ص ۶۰، مطبوعہ دہلی، ۱۹۹۴۔ (۹) کیانی، ایم، آر، جسٹس، افکار پریشاں، ص ۶۲، ۶۳، ۶۴، مطبوعہ لاہور، طبع پنجم، ۱۹۷۹۔ (۱۰) اقبال، علامہ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو ترجمہ، ص ۸۹، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸۔ (۱۱) شہید، قطب، سید، امن عالم اور اسلام، اردو ترجمہ، ص ۲۱ تا ۲۶، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۰۔ (۱۲) خوند میری، عالم، ڈاکٹر، زمان: ''اقبال کے شاعرانہ عرفان کے آئینے میں'' بحوالہ نقوش، اقبال نمبر جلد ۲، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۷۔ (۱۳) قشیری امام، عبد الکریم، رسالہ قشیریہ، ص ۵۴، مطبوعہ مصر۔ (۱۴) سخاوی، شمس الدین، امام، المقاصد حسنہ، ص ۱۶۷، طبع باہتمام مولوی محمد معشوق علی۔ (۱۵) الجراحی، اسماعیل، کشف الغطاء ومزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس، ص ۲۱۵۹، مکتبہ قدسی۔ (۱۶) مذکورہ بالا حدیث سے متعلق تمام حوالہ جات کتاب اللمع فی التصوف، مصنف ابو نصر سراج طوسی، مترجم ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۳۱ و ۳۲، مطبوعہ اسلام آباد سے لیے گئے ہیں۔ (۱۷) غوری، شبیر احمد، اقبال کا تصور زمانہ، بحوالہ نذر عابد، ص ۲۶۳، مطبوعہ دلی، ۱۹۷۴۔ (۱۸) عبد المغنی، اقبال کا نظریہ خودی، ص ۹۴ تا ۹۷، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلی، ۱۹۹۰، کاروانی آصف جاہ، ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ خودی، ص ۵۷، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۷۷، اقبال، علامہ، ڈاکٹر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو ترجمہ، سید نذیر نیازی، مقدمہ، ص ل مطبوعہ بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۸۔ (۱۹) غوری، شبیر احمد، اقبال کا تصور زمان تدریجی ارتقا، بحوالہ نذر عابد، ص ۲۵۱، مطبوعہ مجلس نذر عابد، نئی دلی، ۱۹۷۴۔ (۲۰) قشیری، عبد الکریم، امام، رسالہ قشیریہ، اردو ترجمہ پیر محمد حسن، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰، باب ایک، مطبوعہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۴۔ (۲۱) گیسو دراز، سید، چشتی، شرح رسالہ قشیریہ فارسی، اردو ترجمہ، ص ۴۰، مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ (۲۲) ٹونکی، برکات احمد، سید، اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان، ص ۲۴، مطبوعہ بزم اقبال کراچی۔ (۲۳) نذیر احمد، پروفیسر، تاج الدین محمود اشنوی، معارف، جون، اعظم گڈھ، انڈیا، محمود اشنوی نے یہ بات بیان المکان میں کہی، یہ رسالہ محققانہ مقدمہ کے ساتھ بنام ''غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان'' یا ''غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان'' کے نام سے نذر صابری صاحب نے ۱۶۱۰ھ میں کیمبل پور اٹک سے شایع کیا ہے۔ (۲۴) ابن العربی، شیخ اکبر محی الدین، فتوحات مکیہ، ج ۱، باب ۱۴ اور ۱۵ میں یہ باتیں تحریر کیں۔

❁❁❁❁❁

مولانا شبلی کے خطوط - تدوین جدید کی ضرورت

از:- ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

(۲)

۴- باقیات شبلی یہ دراصل شبلی کے ان نودریافت مضامین، مقالات، خطبات اور خطوط کا مجموعہ ہے جو مقالات شبلی (۸ جلد)، خطبات شبلی (۱ جلد)، مکاتیب شبلی (۲ جلد) کی گیارہ جلدوں میں سے کسی میں نہیں ہے، اسے آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۶۴ میں شایع کیا، عرض مرتب (ص ۱۱-۱۸) کے علاوہ کتاب کی ترتیب دو عنوانات میں منقسم ہے:

مضامین ومقالات: اس کے تحت ۱۹ تحریریں ہیں۔ ص ۱۹ تا ۱۳۵۔

مکاتیب: اس کے تحت ۷۶ نئے خطوط ہیں۔ ص ۱۴۱ تا ۲۲۲۔

ان مکتوبات کا ماخذ اخبارات ورسایل ہیں، مرتب مشتاق حسین نے ہر مکتوب کے ماخذ کا نہ صرف حوالہ دیا ہے بلکہ تصریح طلب امر میں اس پر حاشیہ دے کر صراحت کرنے کی کوشش کی ہے، باقیات شبلی میں شامل مکتوب الیہ کے اسما اور خطوط کی تعداد حسب ذیل ہے:

۱- بنام اڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (خط ۲)، ۲- سر سید احمد خاں (خط ۳)، ۳- نواب اقبال جنگ میر مجلس دایرۃ المعارف (خط ۴)، ۴- مولانا محمد علی مونگیری (خط ۲)، ۵- مفتی شیر علی (خط ۱۴)، ۶- سید ہمایوں مرزا (خط ۲)، ۷- عزیز صفی (خط ۱)، ۸- مولوی بشیر الدین، اٹاوہ (خط ۸)، ۹- مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (خط ۱۵)، ۱۰- نواب محسن الملک (خط ۱)، ۱۱- مولوی عبدالحق (خط ۱)، ۱۲- سید ابن مرتضی بلگرامی (خط ۱)، ۱۳- سید علی حسن خاں (خط ۳)، ۱۴- بنام اعزہ واحباب (عمومی خط ۱)، ۱۵- نواب وقار الملک (خط ۱)، ۱۶- مولانا حمید الدین فراہی (خط ۳)، ۱۷- ڈاکٹر سید محمود (خط ۲)، ۱۸- مرزا سلیم (خط ۶)، ۱۹- اڈیٹر اودھ اخبار (خط ۱)،

☆ ۵۸ نیو آزاد پورم کالونی، چھاؤنی اشرف خاں، ۱۲۲، نگر بریلی، ۲۴۳۱۲۲، یوپی۔

۲۰- حامد نعمانی (خط ۲)، ۲۱- ضیاء الدین برنی (خط ۱)، ۲۲- طیبہ بیگم بلگرامی (خط ۲)۔

۲۲ مکتوب الیہ کے نام یہ ۷۶ خطوط ہیں، ان میں خط کشیدہ ۸ مکتوب الیہ کے نام 'مکاتیب شبلی' میں بھی خطوط ہیں، اس طور ۱۴ مکتوب الیہ نئے ہیں، یہ متفرق ومنتشر خطوط اس سے قبل یک جا اور کتابی صورت میں کہیں شایع نہیں ہوئے۔

۵- خطوط شبلی بنام آزاد (بقلم شبلی) یہ مجموعہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی ترتیب سے بہار اردو اکیڈمی پٹنہ نے ۱۹۸۸ میں شایع کیا، اس میں مولانا آزاد کے ۵۷ خط اور ایک تار شامل ہے، کتابی کوائف کے علاوہ ''عرض حال'' کے عنوان سے مولف کا دیباچہ ہے (ص ۹ تا ۱۲)، اس کے بعد خطوط ہیں، پہلا خط ۲۱/ اکتوبر ۱۹۰۵ کا اور آخری خط ۱۹/ جون ۱۹۱۴ کا مکتوبہ ہے، ۱۵/ نومبر ۱۹۱۴ کا آخری پیغام بہ صورت تار بھی شامل ہے، ہر خط کے متن کے بالمقابل صفحے پر ۵۱ خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں، لیکن مولف نے صراحتاً تو کیا کنایتاً بھی یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ آزاد کے اصل خطوط ان کو کہاں سے حاصل ہوئے اور فی الوقت وہ کہاں ہیں (۱)۔

اس مجموعہ میں شامل ۵۷ خطوط میں سے ۴۰ خط اور ایک تار مکاتیب شبلی جلد اول میں شامل ہو چکے تھے، ان کو بار دگر شامل کر کے اصل خطوط سے ان کا ملان کیا گیا ہے، متن کے معمولی اختلافات جو املا، روش کتابت یا کسی حرف ولفظ کے سہواً چھوٹ جانے یا نقل کرتے وقت غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر اضافہ ہوجانے یا کاتب وناقل کی لغزش قلم کے سبب واقع ہوگئے تھے، ان کو نمایاں کیا گیا ہے، بعض جگہ حواشی بھی دیے ہیں۔

خطوط میں مکتوب نگار کے قلم زد لفظ، جملے اور متن میں بعض محذوف جملوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، ان متنی اختلافات کو مولف نے سید سلیمان ندوی کی اصلاح قرار دیا (ص ۱۹۳) جو بدگمانی کی آخری حد ہے، تحقیقی نتایج اس طرح نکالنا درست نہیں، مکاتیب جلد اول کے مقدمہ میں سید صاحب نے لکھا ہے:

---

(۱) پروفیسر مختار الدین احمد (علی گڑھ) نے مجھے فون پر بتایا کہ انہوں نے حسنین صاحب کے پاس آزاد کے نام شبلی کے جملہ خطوط دیکھے تھے، وفات سے قبل خطوط کا ذخیرہ انہوں نے خدا بخش لائبریری میں محفوظ کرا دیا تھا، انہیں میں شبلی کے خطوط بھی تھے۔

"جلد اول کے اکثر خطوط مولانا (شبلی) کی زندگی ہی میں صاف ہوکر ان کی نظر سے گذر چکے تھے"۔ (مکاتیب، ص ۳)

اس سلسلے میں مولانا شبلی نے محمد سمیع کے نام خط نمبر ۵۴ مکتوبہ ۲۷ر جنوری ۱۹۱۰ء میں لکھا:

"جو خط کسی قدر خاص ہوں ان کو سید سلیمان کے پاس نہ بھیجو، فرصت کے وقت میں خود دیکھ کر فیصلہ کرلوں گا"۔

گویا حذف و اضافے کے اس عمل کا خود مصنف یعنی مکتوب نگار بھی ذمہ دار ہوسکتا ہے، لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اس مجموعہ میں ۱۸ خطوط غیر مطبوعہ ہیں، مجموعے کے آخر میں مطالعہ خطوط عنوان کے تحت (ص ۱۲۲ تا ۱۸۵) ان خطوط کے املا پر گفتگو کی گئی ہے، جو مطالعہ خطوط شبلی کے تعلق سے پہلی کوشش ہے، لیکن مولف، املا اور روش کتابت میں فرق نہیں کرسکے ہیں، شبلی کے مختارات املا پر گفتگو ناکافی ہے، بعض جگہ خطوط کے متن کے پڑھنے میں بھی تسامح ہوا ہے، اس کتاب کی اہمیت شبلی کے ۵۱ خطوط کے عکس کو تاریخی ترتیب میں پیش کرنا ہے اور سرمایہ مکتوبات شبلی میں ۱۸ نئے خطوط کا اضافہ کرنا ہے، ترتیب متن کے لحاظ سے یہ چنداں اہم نہیں۔

۶-مکتوبات مشاہیر خطوط کا یہ مجموعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا، اس میں ۱۸ مشاہیر کے خطوط یکجا کیے گئے ہیں، بعض کے عکس بھی شامل ہیں، یہ خطوط رسالہ ندیم (گیا) کی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۹ء تک کی اشاعتوں سے منتخب کیے گئے ہیں، اس میں شبلی کے ۱۳ خط ہیں جو مولوی سید ولی الحق سنڈا ضلع پٹنہ کے نام ہیں، ڈاکٹر سید محمود کے نام دو خط کے عکس بھی دیے گئے ہیں، ایک خط کا عکس مکتوب الیہ کی نشان دہی کے بغیر دیا گیا ہے، اس طرح کتاب میں کل ۱۵ نئے خط شامل ہوئے مگر مجھے سید محمود کے نام خطوط کے عکس پر شبہ ہے کہ ان کا متن "باقیات شبلی" میں پیش کیا جاچکا ہے، فی الوقت "باقیات شبلی" میری دست رس میں نہیں، اس لیے صحیح صورت سے مطلع کرنا ممکن نہیں۔

۷-متفرق رسائل و کتب میں منتشر خطوط مولانا شبلی کے وہ خطوط جو ان کے کسی مجموعے اور خطوط کے انتخابات میں جگہ نہیں پاسکے، ابھی قابل ذکر تعداد میں ملتے ہیں، ماہنامہ "معارف" کی فائلوں

میں متعدد خطوط مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے، "معارف" کے مستقل عنوان "آثار علمیہ" کے تحت بھی مولانا شبلی کے غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے گئے، ان سبھی تک رسائی نہیں ہوسکی، اس سلسلے میں جو منتشر خطوط میری معلومات میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں: (۱)

سطور گذشتہ میں مولانا شبلی کے جن نئے خطوط کی مکاتیب کے مجموعوں میں نشان دہی کی گئی ہے، ان کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے:

خطوط شبلی	۸۱		
خطوط مشاہیر	۲۱		
باقیات شبلی	۷۶		
خطوط شبلی بنام آزاد	۱۸		
مکتوبات مشاہیر	۱۵	کل تعداد = ۲۱۱	
مکاتیب شبلی	دوجلد	کل تعداد = ۷۴۸	کل دستیاب خطوط= ۹۵۹

۷۵ مکتوب الیہ کے نام یہ ۹۵۹ خطوط ہیں، جو کسی نہ کسی شکل میں کتابی صورت میں محفوظ کیے جاچکے ہیں، ابھی بعض رسائل و کتب میں شامل وہ خطوط جو منتشر ہیں یعنی کتابی صورت میں یکجا نہیں کیے جاسکے ہیں، ان کی اور ان کے مکتوب الیہ کی تعداد طے نہیں ہے، یہ تمام خطوط اور ان کے بعض مکتوب الیہ طے شدہ تعداد پر اضافہ ہوں گے۔

مولانا شبلی کے خطوط کی اہمیت، ان کی مرتب اور منتشر صورتوں اور مختلف انداز کی جمع و ترتیب کی کاوشوں اور طریقہ کار پر سطور بالا میں تفصیل سے گفتگو کی جاچکی ہے، سطور ذیل میں اسی سلسلہ مطالعہ کے وہ پہلو پیش کیے جارہے ہیں جو شبلی کے سرمایہ خطوط کی تدوین جدید کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں:

۱-اب تک مولانا شبلی کے خطوط مکتوب الیہ یعنی افراد کے نام سے تاریخ وار ترتیب دیے گئے، "مکاتیب شبلی" کی اشاعت کے بعد منظر عام پر آنے والے خطوط میں بیشتر کے مکتوب الیہ

(۱) بعض خطوط کی نشان دہی اور ان کے فوٹو عکس ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) نے فراہم کیے، مطلوبہ کتب بھی عنایت کیں، اس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔

مشترک ہیں، اس اشتراک کے باوجود یہ منتشر ہیں، ان کی تاریخ وار ترتیب بگڑ گئی ہے، سلسلہ مراسلت جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات اور افکار و خیالات میں ہم آہنگی کی فضا تشکیل کرتا ہے وہ ان خطوط کے بکھرے ہونے کے سبب متاثر ہے، مثلاً مکاتیب شبلی (ج ۱) میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۲۱ خط شامل ہیں، آخری خط جون ۱۹۱۴ء کا ہے لیکن ''خطوط مشاہیر'' میں یہ تعداد ۳۹ ہوگئی اور آخری خط ۲۱ر جولائی ۱۹۱۴ء کا تحریر کردہ ہے، یہی صورت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط کی ہے، چند دوسرے افراد کے نام بھی خطوط منتشر ہیں، بعض کا ذکر ''باقیات شبلی'' کے تعارف میں کیا جاچکا ہے۔

۲-خطوط اگرچہ تاریخ وار ترتیب دیے گئے ہیں لیکن کہیں کہیں ناقل خطوط یا کاتب مسودہ کی غلطی سے خطوط کی تاریخیں آگے پیچھے ہوگئی ہیں، یعنی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے پہلے آنے والی تاریخ کا اندراج بعد میں آنے والی تاریخ کے بعد ہوگیا، اس قسم کی مثالیں ''مکاتیب شبلی'' اور ''خطوط شبلی'' دونوں میں ملتی ہیں، مکاتیب شبلی سے چند مثالیں:

مسٹر محمد اسحاق کے نام ۵، ۱۴، ۲۲ر جولائی ۱۸۹۹ء کے تین خط ہیں، (خط نمبر ۹، ۱۰، ۱۱) ان کی ترتیب بدل گئی ہے، یعنی ۲۲، ۵، ۱۴ر جولائی ۱۸۹۹ء، اسی طرح ان ہی کے نام ۲۳ر جون ۱۸۹۷ء کا خط ۲۲ر مارچ ۱۸۹۸ء کے بعد درج ہوا ہے۔ (خط نمبر ۶، ۷)

مولوی محمد سمیع کے نام خط نمبر ایک کا قراین سے سال تحریر ۱۸۸۳ء طے کیا گیا ہے لیکن اس کے بعد والے خط نمبر دو پر قراین سے تاریخ تحریر ۲۸ر اپریل ۱۸۸۱ء درج کی گئی، ان ہی کے نام ۱۳ر اپریل کا خط ۱۳ر ستمبر ۱۸۸۳ء کے بعد آیا ہے۔

حاجی معین الدین ندوی کے نام کل دو خط ہیں، مکتوبہ ۱۴ر اگست ۱۹۱۴ء (خط نمبر ۱) و ۴ر جولائی ۱۹۱۴ء، یہاں بھی تاریخی ترتیب الٹ گئی ہے۔

نواب محسن الملک کے نام خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۴ء درج ہے (خط نمبر ۱) لیکن اس پر حاشیہ دیتے ہوئے جامع خطوط نے لکھا ہے:

''خط پر سنہ مرقوم نہیں لیکن عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۹۶ء کا ہے

(ج ۱، ص ۷)، وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے یا جامع خطوط

کا تسامح ہے''۔

خطوط شبلی میں عطیہ فیضی کے نام خط نمبر ۶، ۱۰، ۱۹، ۲۰، ۲۸، ۳۴، ۳۶، ۳۷ کی تاریخیں بے ترتیب ہیں یعنی یہ CHRONOLOGICAL ORDER میں نہیں ہیں، خط نمبر ۲۹ اور خط نمبر ۵۴ پر تاریخ نہیں، خط نمبر ۳۳ کے بعد خط نمبر ۳۵ شروع ہوگیا ہے، اسی طرح آخری خط کو ۵۴ کے بجائے ۵۵ نمبر دیا گیا ہے، خط نمبر ۴۰، ۴۱، ۴۲ پر ایک ہی تاریخ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۰۹ء دہرادی گئی ہے۔

۳- مکاتیب شبلی ج ۱، میں ۴۳ مکتوب الیہ ہیں جن کے ناموں کے ساتھ نمبر شمار کا بھی اندراج ہے لیکن ج ۲، کے نمبر شمار سیریل سے ہٹ گئے ہیں، اس جلد کے پہلے مکتوب الیہ کو ۴۱ نمبر کے تحت شمار کیا گیا ہے جب کہ یہاں ۴۴ کے ہندسے کا اندراج ہونا چاہیے تھا، شماریات کے مطابق ان دونوں جلدوں کے مکتوب الیہ کی کل تعداد ۵۲ ہوتی ہے جب کہ ان کی صحیح تعداد ۵۵ ہے۔

۴- ایک عمومی خط جو سیرۃ النبی کی تالیف سے متعلق ہے جس کی عبارت و مضمون ایک ہی ہے، بیک وقت کئی افراد کو لکھا گیا، یہ خط ۴ مکتوب الیہ کے نام سے مکاتیب شبلی میں نقل ہوا ہے:

بنام مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی	مکتوبہ ۱۴ر اگست ۱۹۱۲ء	(خط نمبر ۱۰۲)
بنام پروفیسر عبدالقادر	مکتوبہ جون ۱۹۱۱ء	(خط نمبر ۱۸)
بنام مولوی ریاض حسن خاں	تاریخ ندارد بہ مقام بمبئی	(خط نمبر ۲۰)
بنام ایم مہدی حسن	تاریخ ندارد	(خط نمبر ۷۳)

خط پر اولین تاریخ جون ۱۹۱۱ء ہے، یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس گشتی خط کا مسودہ جون ۱۹۱۱ میں تیار کیا گیا ہوگا، اس خط کا مزید تین افراد کے نام خطوط میں اندراج زاید ہے۔

۵- مکاتیب شبلی میں بعض خطوط تاریخ و سنہ سے عاری ہیں، بعض کی تاریخیں قراین سے طے کی گئی ہیں لیکن اول الذکر خطوط بھی عمومی ترتیب کا حصہ ہیں، ان کا زمانہ کتابت ان کے اول و آخر خطوں پر مذکور تاریخوں کی درمیانی مدت کو سمجھا جاسکتا ہے، ایسے اکثر مقامات نظر ثانی

اور حاشیے کے طالب ہیں، مثلاً ایم مہدی حسن کے نام خط نمبر ۱۳۹ اپنے مضمون کے لحاظ سے خط نمبر ۳۵ سے پیشتر آنا چاہیے تھا۔

۶- مولانا شبلی عموماً تاریخ عیسوی کا اندراج کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ہجری سنہ بھی لکھ جاتے ہیں، ان تاریخوں کی عیسوی سنہ سے تطبیق نہیں کی گئی۔

۷- مولانا شبلی کے کل خطوط میں رقوم کا اندراج لفظوں یا ہندسوں میں نہیں، حسابی رقوم (یعنی علامتوں) میں ملتا ہے، مولانا شبلی کے تمام مجموعوں میں ان حسابی اقوم یعنی علامتوں کو برقرار رکھا گیا ہے، موجودہ دور میں اقوم درج کرنے کا یہ طریقہ کسی چیستاں سے کم نہیں، اب رقومات کا ہندسوں میں درج کرنا ضروری ہوگیا ہے، سید صاحب نے ''مکاتیب شبلی'' میں بعض مقامات پر علامات کے اوپر ان کے ہندسے بھی دیے ہیں لیکن ایک تو اس کا مستقل اہتمام نہیں ملتا، دوسرے اس سے روپے اور پیسے میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔

۸- مولانا شبلی کے خطوط کے جو مجموعے مرتب ہوئے ہیں ان پر حسب ضرورت حواشی دیے گئے ہیں، سب سے قیمتی حواشی سید صاحب کے ہیں لیکن ابھی بھی بے شمار مقامات ایسے ہیں جن پر حواشی دینا یا ان کی تصریح کرنا ناگزیر ہے، ان خطوط میں متذکرہ اسما، کتب، مقامات وغیرہ کے ناموں اور واقعات کی تاریخوں کا تعین ضروری ہے، مثلاً:

☆ جلدی میں مولوی رحمت اللہ کے انداز تقریر کا میں اندازہ نہ کرسکا۔ (بنام مولوی حمید الدین، خط ۵۲)

مولوی رحمت اللہ کون تھے؟ میری کم آگاہی انہیں تلاش نہیں کرسکی۔

☆ تصاویر کے لیے رعد کو لکھیے۔ (بنام شروانی، خط ۲۶)

☆ رعد کے یہاں چھپنے کا انتظام ہوگا۔ (بنام سلیمان ندوی، خط ۶۵)

☆ آپ نے رعد کو لکھا ہے کہ صورت بھی اچھی چاہتا ہوں۔ (بنام ایم مہدی حسن، خط ۱۳)

☆ رعد غزالی ہی سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔ (بنام ایم مہدی حسن، خط ۱۳)

☆ تقریظ مثنوی کم بخت رعد کے قبضے میں ہے، دو برس ہوچکے۔ (بنام ایم مہدی حسن، خط ۱۴)

☆ لیکن مدراسی صاحب رعد کے اوتار ہیں۔ (بنام ایم مہدی حسن، خط ۲۳)

☆ علم الکلام رعد کے پنجے میں ہے شاید مہینہ بھر میں نکلے۔ (مکتوبات مشاہیر، ص ۵۴)

مذکورہ مثالوں میں رعد سے مراد مطبع نامی کان پور کے مالک منشی رحمت اللہ رعد (ف ۱۹۲۱ء) ہیں جن کے مطبع سے سر سید، حالی اور شبلی کی متعدد کتب شائع ہوئیں، یہ مطبع خوبصورت طباعت کے لیے اپنے عہد میں مشہور تھا، اس مطبع سے مولانا شبلی کی حسب ذیل کتب کی اشاعت میرے علم میں ہے:

دیوان شبلی (۱۸۹۳ء)، علم الکلام (۱۸۹۶ء)، الفاروق (۱۸۹۹ء)، نالہ موزوں فارسی ترکیب بند (قیاساً ۱۹۰۲ء)، الغزالی (۱۹۰۲ء)، الکلام (۱۹۰۴ء)، سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء)، سیرۃ النبی (۱۹۱۸ء)۔

☆ شاہ صاحب کی قبل از وقت جدائی نے واقعی سخت صدمہ پہنچایا۔ (بنام مہدی حسن، خط ۳۷)

یہاں شاہ صاحب سے کون بزرگ مراد ہیں پتا نہیں چلتا۔

☆ شبلی متعلم یا تو بالکل بے کار تھے یا اب پندرہ دن تک ان کو کوئی کام نکل آیا۔ (بنام مسعود علی، خط ۳۳)

☆ درجہ تکمیل والوں کے ساتھ شبلی یہاں چلے آئیں۔ (بنام مسعود علی، خط ۲۱)

مکاتیب شبلی میں شبلی نام کے دو افراد کا ذکر ملتا ہے، حیات شبلی (ص ۶۸۵) کے ایک حاشیے سے پتا چلتا ہے کہ دارالعلوم میں ان دنوں تین شبلی جمع تھے، علامہ شبلی نعمانی معتمد دارالعلوم، مولوی شبلی مدرس، مولوی شبلی متعلم، سید سلیمان ندوی کے نام خط نمبر ۱۳ اور ۶۸ میں بھی شبلی کا ذکر آیا ہے، اس کے حاشیے میں سید صاحب نے لکھا ہے:

''مولوی شبلی متکلم ندوی مدرس اول و مہتمم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر'' لیکن مذکورہ دو مقامات پر حاشیے کی ضرورت محسوس نہیں کی، دراصل یہاں شبلی متعلم (یعنی طالب علم) مراد ہیں، علم کلام کی تکمیل کے بعد ان کے نام کے ساتھ متکلم کا لاحقہ جوڑ دیا گیا تھا۔

☆ اہل خانہ نے انتقال کیا۔ (مکتوبات مشاہیر، ص ۵۷)

یہاں اہل خانہ سے مراد زوجہ ثانی ہیں۔

☆شعر العجم اول اول دہلہ میں خراب بندھی تھی۔ (بنام حمید الدین، خط ۴۸)

☆اڈریا نوبل کی واپسی کا مادہ تاریخ ...... نکلا۔ (بنام سید سلیمان ندوی، خط ۵۲)

ان غیر معروف مقامات کی نشان دہی کی جانی چاہیے۔

☆اگر چھاؤنی وغیرہ کا آلھا ہو تو کچھ ضرر نہیں۔ (بنام محمد سمیع، خط ۳۹)

☆سو روپے ہیں، چھاؤنی، عالیہ اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے۔ (بنام محمد اسحاق، خط ۱۹)

چھاؤنی سے مراد غالباً وہ جگہ ہے جہاں شبلی کے والد زوجہ ثانی کے ہم راہ رہتے تھے، عالیہ شبلی کی سوتیلی ماں یا ان کی زوجہ ثانی کا نام معلوم ہوتا ہے۔

☆"صلائے عام" کے ساتھ آپ کی حد سے زیادہ خوش اعتقادی دیکھ کر بے اعتقادی پیدا ہو چلی۔ (بنام مہدی، خط ۵۹)

"صلائے عام" دہلی سے شائع ہونے والے ایک رسالے کا نام ہے۔

☆دکن کی بجلی پھر لکھنؤ پر گرنے والی ہے۔ (بنام مہدی حسن، خط ۵۷)

☆بدر کامل حیدر آباد سے دلی پہنچ کر غروب ہو گیا۔ (بنام آزاد، خط ۲۱)

☆برج خاکی پر قبضہ ہو جائے تو لکھیے گا۔ (بنام آزاد، خط ۷)

☆برج خاکی ابھی تو ہوا پر ہے۔ (بنام آزاد، خط ۸)

☆ماہ تمام بنگال کے افق پر نکلا۔ (بنام آزاد، خط ۷)

دکن کی بجلی، بدر کامل، برج خاکی، ماہ تمام، یہ تمام استعارے اور رموز پیرایہ بیان مولانا شبلی کے مخالفین کو بدگمانیوں کا موقع دیتے ہیں، ان پر مناسب نوٹ دینا ہوگا۔

۹- مکاتیب شبلی میں متعدد خطوط وہ ہیں جن کی عبارتوں کے درمیان نقطے لگا کر جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے، یعنی ان مقامات سے خوف فساد خلق یا دلآزاری کے خیال سے بعض افراد اور کتب وغیرہ کے نام حذف کردیے گئے تھے، تحقیقی اصول اور تدوین متن کے ضابطے اپنی جگہ، اخلاقیات کے تقاضے بھی بہت کچھ کر گزرنے پر مجبور کرتے ہیں، موجودہ دور میں ظاہری اخلاق پر

حقیقت بیان نے اہمیت حاصل کرلی ہے، چنانچہ ان خطوط کا مطالعہ کرتے وقت قاری ایک عجیب الجھن سے دوچار ہوتا ہے، بعض ذہین قاری اپنے مطالعے کی روشنی میں ایسے مقامات پر متعدد نام رکھ کر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے تمام مقامات کو اصل خطوط (بشرطیکہ وہ کہیں محفوظ ہوں اور دست یاب ہو جائیں) حاصل کرکے نئی ترتیب وتدوین میں پر کردینا مناسب ہوگا، کیوں کہ متن مصنف کی ملکیت ہے، متنی تنقید کسی بھی مصلحت کے تحت کسی دوسرے شخص کو اس میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں دیتی، خواہ وہ اخلاقیات کے کیسے ہی زریں اصولوں کے تحت حذف کیے گئے ہوں، مثلاً:

☆مولوی ...... صاحب خود پابند تھے۔ (بنام حبیب الرحمن خاں شروانی، خط ۸۶)

☆...... نہ فن کے ماہر تھے، نہ کبھی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے۔ (بنام حبیب الرحمن خاں شروانی، خط ۷۷)

☆...... بڑی آمادگی سے ...... سکریٹری شپ کی کوششیں کررہے ہیں۔ (بنام حبیب الرحمن خاں شروانی، خط ۷۶)

☆ہاں مدرسہ ...... نے ندوہ کو نقصان پہنچایا۔ (بنام منشی محمد امین، خط ۸)

☆ایک پرچہ ...... نام وہاں سے نکلنا شروع ہوا ہے جو الندوہ کی چوٹ پر ہے۔ (بنام منشی محمد امین، خط ۸)

☆اشرار ...... کا جواب لکھنا ضروری ہے۔ (بنام سید سلیمان ندوی، خط ۴۴)

☆یہ ایک باقاعدہ اور منظم کوشش ہے جو ...... وغیرہ کی طرف سے کی جارہی ہے۔ (بنام سید عبدالحکیم دسنوی، خط ۲)

☆...... والوں نے ندوہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ (بنام آزاد، خط ۱۱)

موخر الذکر مثال آزاد کے جس خط سے ماخوذ ہے، اس کا عکس سید محمد حسنین کی کتاب "خطوط شبلی بنام آزاد"، ص ۵۳ پر دیا گیا ہے، اس میں "والوں نے" سے قبل "دیوبند" کا لفظ ہے، جو "مکاتیب شبلی" میں حذف کردیا گیا تھا، اس طرح جملہ صاف ہوگیا کہ "دیوبند والوں نے ندوہ کو سخت نقصان پہنچایا"۔

۱۰- مولانا شبلی کے خطوط میں بعض عبارتیں اور فقرے ایسے ہیں جن کو ان کے معاندین نے اپنے مافی الضمیر کے ثبوت میں پیش کر کے ایک خاص اور نئے معنی دیے ہیں، شیخ اکرام کی ''شبلی نامہ'' میں اس کی بہ کثرت مثالیں ہیں، تدوین جدید کے وقت ان خطوط کے ایسے تمام مقامات کے مفاہیم مصنف کے انداز فکر، اس کے شخصی مختارات، اس کے پیرایہ اظہار و بیان کی روشنی میں طے کیے جائیں گے، اگر لفظوں سے متبادر معانی و مفاہیم واقعات سے مطابقت نہیں رکھتے، انہیں حواشی سے واضح کیا جائے گا، مرتب متن کے فرائض میں صرف لفظوں کی ترتیب، ان کی صورتوں کی تعیین ہی نہیں بلکہ ان کے معانی و مفاہیم کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنا بھی ہے۔

۱۱- مکاتیب کے جملہ مجموعوں اور انتخابات میں مولانا شبلی کے ۱۴۷ مکتوب الیہ کے اسما آئے ہیں (متفرق مکتوب الیہ ان پر اضافہ ہوں گے) لیکن ان سب کے کوائف پر ان مجموعوں میں نوٹ نہیں، سید صاحب نے بعض اہم اور مختار مکتوب الیہ کے حالات میں چند سطری تعارفی نوٹ حاشیوں میں لکھے ہیں، ضرورت ہے کہ ان سبھی کی سوانح پر تحقیقی نوٹ لکھا جائے اور مولانا شبلی سے ان کے تعلق کی کیفیت و نوعیت کو بھی آشکارا کیا جائے، جیسے کہ مرزا محمد عسکری نے ''ادبی خطوط غالب'' (لکھنؤ ۱۹۲۹ء) میں مرزا کے مکتوب الیہ کے حالات کے ضمن میں کیا ہے، اس تعلق کے واضح ہوجانے کے بعد خطوط کے مفاہیم سے استفادہ نسبتاً آسان ہوجائے گا۔

یہ تھے وہ پہلو جو مولانا شبلی کے خطوط کی جدید تدوین کی ضرورت کا بہ صورت ''کلیات'' احساس دلاتے ہیں، ''کلیات مکاتیب شبلی'' کا متنی اڈیشن تیار کرتے وقت تدوین متن کے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے، کن اصولوں کو زیادہ اہمیت دی جائے، یہ اور اسی قسم کے سوالات دراصل ایک علاحدہ مضمون کے طالب ہیں، مختصراً اس سلسلے میں چند معروضات پیش کی جارہی ہیں:

۱- اردو میں خطوط مرتب کرنے کی دو صورتیں متعارف ہیں، اول افراد یعنی مکتوب الیہ کے نام سے، دوم زمانہ کے اعتبار سے، پہلی صورت عرصہ دراز سے رائج و مقبول ہے، اردو مکاتیب کے مجموعے اسی طریقے پر ترتیب دیے جاتے ہیں یہ سہل بھی ہے اور عرف عام میں

پسندیدہ بھی، اس سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلق کی نوعیت و کیفیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن خود مکتوب نگار کی زندگی کے سلسلہ وار واقعات، ذہنی نشو نما، افکار و رجحان میں واقع ہونے والی زمانی تبدیلیوں اور نثری اسالیب کے ارتقا کو ہم مطالعے کے دوران محسوس کرتے آگے نہیں بڑھتے بلکہ یہ جاننے کے لیے ہمیں بار بار ورق گردانی کرنی پڑتی ہے اور ایک خط کے مضمون کو دوسرے سے ملاکر یعنی مربوط کر کے انہیں زمانی تسلسل میں دیکھنا پڑتا ہے، افراد کے نام سے مرتب کیے گئے خطوط کے مجموعوں میں مکاتیب شبلی (سید سلیمان ندوی) مکاتیب غالب (امتیاز علی خاں عرشی) غالب کے خطوط (خلیق انجم) اہم ہیں۔

دوسری صورت میں خط کے زمانہ کتابت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، زمانی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخی ترتیب یعنی CHRONOLOGICAL ORDER میں خطوط کو ترتیب دیا جاتا ہے، اردو میں اس کی واحد مثال کلیات مکاتیب اقبال (مرتبہ مظفر حسین برنی) ہے۔

راقم الحروف کی نظر میں ''کلیات مکاتیب شبلی'' کی تدوین کے لیے دوسری صورت یعنی طریقہ ترتیب زیادہ مناسب ہوگا، کیوں کہ مکاتیب شبلی کی دو جلدیں پہلے طریقہ ترتیب پر قیمتی حواشی کے ساتھ موجود ہیں، دوسرے طریقہ کار سے خطوط کی ترتیب میں ایک خاص ربط اور زمانی تسلسل پیدا ہوجائے گا اور اس طرح یہ خطوط شبلی کی سوانح، ان کے ذہنی ارتقا، علمی و ادبی سفر، کسی خاص دور میں ان کے مخصوص رجحان یا فکری محور سے بھی ہم کو مطلع کریں گے۔

۲- مولانا شبلی کے خطوط کی اصل یا عکس جو دست یاب ہیں، مطبوعہ متن سے ان کو ملاتے ہوئے متن کے اختلاف کی نشان دہی کرنا ہوگی، انہیں کی بنیاد پر مولانا شبلی کے مختارات املا کی بھی تعیین کی جائے گی۔

۳- مولانا شبلی کے فارسی و عربی خطوط کے متن کو آخری جلد میں ترتیب دیا جائے گا لیکن ان کا اردو ترجمہ اردو خطوط کے ساتھ ہی تاریخی ترتیب کو مکمل کرنے کی غرض سے شامل کر دینا مناسب ہوگا، اس طرح ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۴ء تک کی روداد زندگی سے واقف ہونا آسان ہو سکے گا۔

۴- ''کلیات مکاتیب شبلی'' کی تدوین میں، تدوین متن کے انہیں اصولوں کی پابندی

کی جانی چاہیے جو ہمارے آزمودہ کار اور معتبر متنی نقاد مولانا امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء)، قاضی عبدالودود (ف ۱۹۸۴ء)، پروفیسر نذیر احمد، جناب رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر حنیف نقوی وغیرہ اپنے اپنے مرتبات میں بروئے کار لاچکے ہیں، البتہ حواشی، اختلاف متن، معانی ومفاہیم کی توضیح، تلفظ کی نشان دہی، اشعار وآیتوں کی تخریج وغیرہ متن کے ساتھ ہی اسی صفحے پر حاشیے میں دینا مناسب ہوگا، اس سلسلے میں مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں کی حیثیت بنیادی نسخے کی ہوگی، رہیں خطوط کی تاریخیں، املا، اوقاف نگاری، اعراب نگاری، قرأت، اشخاص، کتب، مقامات، واقعات وغیرہ پر حواشی، مقدمہ، مکتوب نگار ومکتوب الیہ کے حالات، خطوط کے دست یاب جملہ عکس، خطوط کی جملہ اشاعتیں، انشائے شبلی کی خصوصیات، اشخاص، کتب، مقامات کا اشاریہ وغیرہ ان کے بغیر تدوین کا عمل مکمل نہیں ہوسکے گا، حسب ضرورت ان عنوانات پر توجہ صرف کرتے ہوئے، ان میں اجمال وتفصیل اختیار کرنی ہوگی۔

آخر میں یہ بات پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ خطوط کے ذریعے جدید نثر کی بنیاد رکھنے والے مرزا غالب کے بعد اردو مکتوب نگاری میں مولانا شبلی اظہار بیان کی ایک زندہ اور فعال قوت کے طور پر ہمارے سامنے آئے ہیں، ان کی نثر پر غالب کے اثرات ہیں یا نہیں یہ علاحدہ موضوع ہے لیکن اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں غالب کے بعد وہ دوسرے بڑے مکتوب نگار ہیں جن کے اثر سے اردو نثر کو بے نیاز نہیں کہا جاسکتا۔

اکبرالہ آبادی کے ایک شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، جو بہ ظاہر لفظ شبلی کا قافیہ فراہم کرنے کی ایک فی البدیہہ کوشش کے ضمن میں آتا ہے لیکن مضمون کے لحاظ سے یہ میرے خیال کی ترجمانی کررہا ہے۔

واہ! کیا بات ہے، تری شبلی
نثر میں بھی، ادائے غالب لی

اخبار علمیہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت جو نسخہ قرآن مجید ان کے زیر تلاوت تھا اور اس پر ان کے خون کے دھبے بھی تھے وہ تاشقند کے علاقہ ہست امام کی ایک لائبریری میں محفوظ ہے، اس کے ایک جز کا عکسی نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں بھی ہے، لائبریری سے متصل دسویں صدی ہجری کے معروف اسلامی اسکالر کفیل شاشی کا مقبرہ، قدیم مسجد اور مدرسہ بھی ہے، کتب خانہ میں اسلامی دور حکومت کی بیس ہزار کتابیں اور قریباً تین ہزار مخطوطات ہیں جو عہد وسطی کی تاریخ، علم نجوم، طب، تفسیر اور قوانین اسلامی کے موضوعات پر ہیں، ان سب میں قدیم ترین قرآن مجید کا نسخہ ہے جو ۶۵ء میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ۱۹ برس بعد مدون ہوا تھا، یہ ہرن کے چمڑے پر کوفی خط میں ہے اور بڑے حرفوں میں لکھا ہوا ہے، اس نسخہ سے شاہان اسلام کو خصوصی دل چسپی تھی، اسی وجہ سے اس کو متعدد اسلامی ملکوں میں منتقل کیا جاتا رہا، منتقلی کے سبب اس کے کچھ اوراق ضائع بھی ہوگئے تاہم ۲۵۰ صفحات آج بھی محفوظ ہیں، حضرت عثمانؓ کے ۵ مدونہ قرآنی نسخوں میں ایک نسخہ کا کچھ حصہ استنبول کے توپکاپی پیلس میں ہے، مذکورہ نسخے کو شیشے کے فریم میں رکھ کر وولٹ میں بند رکھا گیا ہے جس کو آہنی دیواروں سے گھیر دیا گیا ہے، یہ نسخہ پہلے حضرت علیؓ اپنے ساتھ کوفہ لے گئے تھے، پھر تیمور لنگ کے زمانہ میں یہ سمرقند لایا گیا، سمرقند پر روس کا قبضہ ہوا تو اسے سینٹ پیٹرس برگ کی امپیریل لائبریری میں بھیج دیا گیا، لینن نے اس کو باشکورتوستان کے مقام "اوفا" کی لائبریری میں رکھوایا، کمیونسٹوں کے دور حکومت میں اس کی عام نمائش پر پابندی عاید تھی مگر اب مسلمانان تاشقند نے اس کو حاصل کرکے اپنے یہاں جدید الکٹرانک انتظامات کے تحت محفوظ کردیا ہے، دنیا کے اہم سربراہوں کے دورے کے موقع پر اس کی نمائش کرائی جاتی ہے۔

علمی وتعلیمی فروغ کے لیے متعدد کالجوں کو دی جانے والی رقوم میں سعودی خواتین کے خاص پروفیشنل کورسز کے لیے ۱۲ اربلین سعودی ریال مختص کیا گیا ہے، اس سے دارالسلطنت ریاض میں ایک ایسے کالج کے قیام کا منصوبہ ہے جس میں ۲۴ ہزار کے قریب طالبات بیک وقت داخلہ

لے سکیں گی، یہ ریاض میں قایم امام محمد بن سعود اسلامک یونی ورسٹی کے وقار و مقبولیت میں اضافہ کا سبب ہوگا، یہ یونی ورسٹی ۱۹۵۴ء میں قایم کی گئی اور مدینہ کی ام القری یونی ورسٹی کے بعد تیسری قدیم یونی ورسٹی ہے، اس کا آغاز دو کالجوں سے کیا گیا تھا، ایک میں عربی زبان اور دوسرے میں اسلامک لا نہ یعنی شرایع اسلامی کی تعلیم دی جاتی تھی مگر اب اس کے تحت درجنوں کالج ہیں اور کل ۵۵ ہزار طلبا و طالبات اپنی علمی تشنگی بجھا رہے ہیں۔

آسٹریلیا کے مسلمانوں نے یورپی ملکوں کے چیچن پناہ گزینوں کو قرآن مجید مع روسی ترجمہ تقسیم کیا ہے تاکہ ان کا رشتہ اسلامی عقاید و تعلیمات اور شرایع سے جڑا رہے اور وہ عربی زبان کی تعلیم سے بھی آراستہ ہو جائیں اور ان ممالک میں جاری ارتداد کی زد سے محفوظ رہیں، اس اہم دینی خدمت کی انجام دہی کا سہرا طبی پیشے سے وابستہ فرید سلیمان کے سر ہے، ویانا شہر کے اطراف میں واقع کیمپ کے بیس چیچن خانوادوں کو اب تک قرآن مجید کے سو نسخے دیے جا چکے ہیں، ایک چیچن پناہ گزیں ملازمہ کا کہنا ہے کہ عیسائی چیچن مسلمانوں کو ارتداد کی جانب لے جانے کا کوئی موقع نہیں گنواتے اور ہمیں ہمہ وقت اپنی اس مہم کا ہدف بناتے ہیں، لہذا قرآن مجید تقسیم کرنے کی مہم تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی آیندہ نسلوں کو عیسائی ریشہ دوانیوں سے محفوظ کیا جا سکے۔

"کرنٹ سائنس" میں شایع رپورٹ کے مطابق بھابھا ایٹمی ریسرچ سنٹر کے سائنس داں جگن ناتھ اور او ما پال نے دعوا کیا ہے کہ نئی تنصیب ہندوستان کو ایٹمی شعبہ میں خود کفیل بنادے گی کیونکہ ہندوستان اب ایٹمی توانائی کے لیے یورینیم کے بجائے تھوریم کا استعمال کرے گا، تھوریم ہندوستان میں کافی مقدار میں موجود ہے، اس تنصیب میں گو پلوٹیم کی بھی ضرورت پڑے گی لیکن چونکہ پلوٹیم کو استعمال شدہ ایندھنوں سے نکالا جا سکتا ہے، اس لیے ہندوستان کے سامنے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں، ہندوستان کی ایٹمی ٹکنالوجی کے اس اہم کارنامے سے قدرتی اور افزودہ یورینیم سے بھی بہت حد تک بے نیازی ہو جائے گی۔

یو ایس کنزیومر پروڈکٹ سیفٹی کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گھر میں کاغذ کے کترن بچوں اور پالتو جانوروں کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں، یہ رپورٹ نیو یارک اسکول آف میڈیسن کے ماہرین کے ذریعہ تیار کی گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ کاغذ کے ٹکڑے مشینوں کے ذریعہ

تیار کیے جاتے ہیں، اس سے بچوں کے ہاتھ زخمی ہو سکتے ہیں لیکن رپورٹ میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ نقصان کس عمر کے بچوں کو ہوگا اور کس طرح پہنچے گا۔

انڈونیشیا کے فوجا نامی پہاڑی جنگل میں ایک ایسے علاقہ کا پتا چلا ہے، جہاں متعدد نسل کی مینڈکوں، پرندوں، پیڑ والے کنگاروؤں اور رنگ برنگی تتلیوں کا بسیرا ہے، اس علاقہ کا سراغ آسٹریلیا اور انڈونیشیا کے پچیس سائنس دانوں کے ایک گروپ کی مشترکہ کوششوں سے لگا، انہوں نے ہیلی کاپٹر سے اس علاقہ کی سیر کی، وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی بتا رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اسے دیکھ کر "گارڈن آف ہیڈن" یعنی جنت ارضی کا منظر آنکھوں میں پھرنے لگا، جبل فوجا ۱۲ سو میل کے فاصلہ پر محیط ہے، ۷۲۱۸ فٹ اس کا سطح ارتفاع ہے، اس علاقہ کا کچھ پتا لوگوں کو اب تک نہیں تھا، اس سے متصل آبادی کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈر کے سبب ہم لوگوں نے یہاں کبھی جانے کی ہمت نہیں کی، ٹیم کا بیان ہے کہ یہاں شہد کھانے والے پرندے ہیں جن کے چہرے پر نارنگی رنگ کا چمک دار دھبہ تھا، مینڈک اور تتلیوں کی بیس نئی نسلیں دیکھنے کے بعد سائنس دانوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، کھجور کے پانچ نئے قسم کے درخت بھی تھے جس کی تصویریں انہوں نے اپنے کیمرے میں قید کی ہیں۔

ک، ص اصلاحی

فارم VI

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت: دارالمصنفین، اعظم گڈھ۔
نوعیت اشاعت: ماہانہ۔
نام پرنٹر: ضیاء الدین اصلاحی۔
قومیت: ہندوستانی۔
پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نام پبلیشر: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت: ہندوستانی۔
پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

اڈیٹر: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت: ہندوستانی۔
پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں ضیاء الدین اصلاحی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

ضیاء الدین اصلاحی

معارف کی ڈاک

معارف کے سائنسی مقالات

سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن
خالص پور، اعظم گڈھ
۱۳/۲/۰۶ء

برادرم محترم ومکرم۔ السلام علیکم!

معارف کے جنوری وفروری ۲۰۰۶ کے شمارے پیش نظر ہیں اور ان میں شایع شدہ درج ذیل وقیع وگراں قدر مقالات اس تحریر کا محرک:

۱-قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے از: پروفیسر ایم-ایس خان۔

۲-سورہ انبیا کی ایک آیت از: محبوب الرحمن فاروقی۔

اور

۱-رسول اللہ ﷺ کے صاحب زادے کی وفات ...... از: انیس الرحمن ندوی۔

۲-ریاضیات کا ماہر: عمر خیام از: عبدالرحمن شریف۔

دونوں شماروں میں چار چار مقالات شامل ہیں اور دونوں میں ہی مذکورہ بالا دو دو مقالات کا تعلق سائنس سے ہے، مبارک باد! یقین ہے کہ اگر علامہ شبلیؒ حیات ہوتے تو معارف میں رجحان کی اس خوش گوار تبدیلی سے خوش ہوتے، برائے کرم اس طرز کو باقی رکھیے، یہ آج کی ضرورت ہے۔

دراصل! بات زبان وبیان کی ہو یا زیر تحقیق مواد کی، علامہ شبلیؒ نے عصری تقاضوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اگر انہوں نے ماضی کی طرف دیکھا تو "پدرم سلطان بود" کے جذبہ سے نہیں بلکہ اس مقصد سے کہ گزرتے ماہ وسال کے فطری گرد وغبار صاف کر کے، حال کے آئینہ میں جائزہ لیا جائے تاکہ مستقبل میں مہمیز کا کام آسان ہو جائے، آج کا دور سائنس وٹکنالوجی کا دور ہے، ضرورت ہے کہ اس ضمن میں اسلاف کے کارناموں کا سلیقہ سے جائزہ لیا جائے تاکہ مسلم دانش وروں کی مغرب سے مرعوبیت اور انفعالیت ختم ہو اور سائنسی انکشافات کے ضمن میں "مسلم نشاۃ ثانیہ" کی

داغ بیل رکھی جاسکے، ہاں یہ بھی اشد ضروری ہے کہ ماضی کے ہمارے سائنسی کارناموں کا رشتہ (بہ طور واقعہ) قرآن حکیم اور سنت اقدس سے بھی جوڑا جائے کہ ان کے محرکات اولی وہی تھے۔

اور اس ضرورت کو دارالمصنفین اور معارف نہیں پوری کریں گے تو کون کرے گا؟

اخبار علمیہ کے مندرجات قابل قدر ہوتے جارہے ہیں۔

والسلام
خاکسار
ابرار اعظمی

خریطۂ جواہر

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
چمپارن (بہار)
۲۷/ جنوری ۲۰۰۶ء

مخدومنا المکرم، دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے۔

معارف دسمبر ۲۰۰۵ء کے جملہ مقالات پسند آئے، ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کے مقالہ "علامہ شبلی نعمانی کی انفرادیت اور امتیازات" پر اپنے تاثرات ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

"خریطۂ جواہر" کے اغلاط کی تصحیحات پر نواب رحمۃ اللہ خاں شروانی اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار، صرف دارالمصنفین ہی نہیں بلکہ فارسی زبان وادب سے دل چسپی رکھنے والے جملہ ارباب علم کی طرف سے شکریہ ادا کیے جانے کا مستحق ہیں، میرے خیال میں بعض اشعار ہنوز محتاج تصحیح ہیں:

۲۷- حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
بہ سر نو کوفتہ باشد دو سرائے ترا

{ "دو" کو "در" ("ر" کی اضافت کے ساتھ) پڑھا جائے }

دوسرے مصرع میں "درسرائے ترا" کی بہ جائے "درسرائے را" ہونا چاہیے، (یعنی "ترا" کی جگہ "را") [1]

---

[1] اول الذکر کی تصحیح دسمبر میں ہو چکی ہے مگر بیدار صاحب نے موخر الذکر کی تصحیح نہیں کی تھی، خریطۂ جواہر مطبوعہ دارالمصنفین میں بھی یہ غلطی موجود ہے، مطبع مصطفائی میں "ترا" کی جگہ "را" ہے اور یہ صحیح ہے۔

۷۲- بہ پائے شمع خود شاہد کہ من ہم ......

زبان خویش اے پروانہ دستے برسر من کن

{ دوسرے مصرع میں ''زبان'' کو ''ز، بال'' اور ''کن'' کو ''کش'' پڑھیے }

پہلے مصرع کے آخر میں کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں، جس کی وجہ سے دونوں مصرعے دو بحروں میں ہوگئے ہیں۔ [۱]

۷۷- منادی می کند امروز ز فار ہر زلفش

کہ بے ایماں بمیر دد ہر کہ ایماں را نگہہ دارد

{ مصرعہ اول میں ''ہر'' مصرع کو ناموزوں کررہا ہے، اسے ''سر'' پڑھا جائے }

یہاں دوسرے مصرع میں ''بمیر د'' اور ''ہر'' کے درمیان ''د'' [۲] کا حرف حذف کرنے کے بعد ہی دوسرا مصرع موزوں ہوگا۔

۱۱۲- ہمہ جور می ترستند و من از لطف بسیارش

{''ترستند'' = ترسند }

اس مصرع میں ''جور'' سے پہلے ''از'' کے اضافہ کرنے کے بعد ہی مصرع موزوں ہوگا۔ [۳]

''خریطۂ جواہر'' کی نئی طباعت کب ہو رہی ہے؟ اس کے پرانے نسخے موجود ہیں یا نہیں؟ بہت پہلے آپ نے اپنے ایک مکتوب میں مطلع کیا تھا کہ مولانا اقبال سہیل مرحوم کے عزیزوں نے مولانا کی کلیات شائع کی ہے، بہ راہ کرم کلیات کا ایک نسخہ بہ ذریعہ وی پی بھجوادیں، جامعہ کراچی پاکستان سے معارف کا اشاریہ چھپ کر آچکا ہو تو ''کلیات'' کے ساتھ اس کا بھی ایک نسخہ قیمتاً بھجوانے کی زحمت فرمائیں، اگر نہ آیا ہو تو میرے لیے بھی ایک نسخہ منگوادیں، کیا محمد سہیل شفیق صاحب کو اس پتے پر خط لکھا جاسکتا جو ان کے مکتوب کی پیشانی پر معارف میں درج ہے؟ اگر کوئی دوسرا پتا ہو تو آگاہ فرمائیں۔

ستمبر اور نومبر ۲۰۰۵ء کے شماروں میں غزلوں کی اشاعت پر تہ دل سے ممنون ہوں، ایک

۱ ہم کے بعد کے الفاظ کی جگہ نقطے ہیں جو یہ ہیں ''من ہم جان پرافشانم''۔ ۲ یہ کمپوزنگ کی نئی غلطی ہوگئی۔ ۳ یہ بھی کمپوزنگ اور عدم تصحیح کی نئی غلطی ہے۔

تازہ ترین غزل اشاعت کے لیے ارسال ہے۔

ان دنوں طبیعت پہلے سے ٹھیک ہے، اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں، نیا سال مبارک۔

والسلام
نیازمند
وارث ریاضی

متحدہ قومیت اور املا کے بعض مباحث

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
چمپارن (بہار)
۱۵/۲/۲۰۰۶ء

مخدوم گرامی قدر، زیدت عنایاتکم

السلام علیکم

۲؍فروری کا عنایت نامہ ۱۰؍فروری کو نظر نواز ہوا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے نزدیک ''متحدہ قومیت'' عبارت ہے استخلاص وطن کے لیے ہندو مسلم مخلصانہ اتحاد واشتراک کار سے یقیناً یہ تعبیر باعث اشتباہ ہے لیکن اس اشتباہ کو مولاناؒ نے اپنے متعدد بیانات اور تحریروں سے دور کردیا ہے، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ رقم طراز ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ ''متحدہ قومیت'' کا لفظ ایک حد تک مغالطہ میں ڈالنے والا ہے اور خصوصاً اس وقت جب کہ اس کا اعلان ان لوگوں کی طرف سے ہو جو مذہب وملت کی تفریق کو بالکل ناقابل اعتنا قرار دیتے ہوں اور وطنی اشتراک پر تمام تحریکوں کی بنیاد رکھتے ہوں، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ایک مبہم کلام کی اصل مراد کا تعین متکلم کی خود اپنی تفصیل وتشریح سے، اس کی زندگی کے واضح احوال وکوائف سے اور اس کے ذاتی رجحانات ومعتقدات کی روشنی میں ہی ہوسکتا ہے تو ایک مومن صادق کا فرض ہے کہ وہ محض کسی ایک مبہم لفظ کو سن کر، اپنی طرف سے کوئی خاص مفہوم مراد لے بلکہ خود متکلم کے بیان سے اس کا مطلب متعین کرنے کی

کوشش کرے، مولانا حسین احمد مدنی صاحب قبلہ "متحدہ قومیت" سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اس کی توضیح وہ متعدد بیانات میں کر چکے ہیں"۔ (مدنی و اقبال نمبر، ماہنامہ الرشید، ساہیوال پاکستان، ص ۲۱۷ و ۲۱۸)

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس جون پور میں مولانا کے پیش کردہ خطبہ صدارت سے ایک اقتباس درج کیا ہے، جس میں مولانا مدنی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "متحدہ قومیت" سے ان کی مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو یورپین اقوام میں سمجھا جاتا ہے، ناچیز نے استدراک میں وہ اقتباس درج کردیا ہے، اس لیے یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب مذکورہ خطبہ صدارت سے ماخوذ اقتباس درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس کے بعد کسی مسلمان کو یہ اشتباہ نہ رہنا چاہیے کہ مولانا (مدنی) نے "متحدہ قومیت" سے کوئی مفہوم ایسا مراد لیا ہے جو شریعت اسلام کے منشا یا مسلمانان سلف کے کسی عمل کے خلاف ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی مراد کو ظاہر کرنے کے لیے مولانا نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، اس میں شائبۂ مجاز پیدا ہوجانے کی وجہ سے مسامحت ہوگئی ہے لیکن منطق کا مسلمہ اصول "لا مشاحة فی الاصطلاح" اس مسامحت کے لیے وجہ اعتذار ہوسکتا ہے"۔ (ایضاً ص ۲۱۸)

ہاں "جمعیت علمائے ہند" ہی صحیح املا ہے، تصحیح کے لیے شکر گزار ہوں، اسی طرح فرایض، ناجایز اور فایدہ جیسے الفاظ میں نے جہاں جہاں استدراک میں "ی" کے ساتھ لکھے ہیں ان کی "ی" کو "ہمزہ" سے بدل دیا جائے، اس سلسلے میں آپ کا اور جناب شمس الرحمن فاروقی صاحب مدظلہ کا نقطہ نظر درست ہے، آپ کی توجہ دلانے پر میں نے فرہنگ آصفیہ سے رجوع کیا تو اس میں مذکورہ الفاظ "ہمزہ" ہی سے لکھے گئے ہیں، جناب رشید حسن خاں صاحب نے تو اپنی کتاب "اردو املا" میں ایک قاعدہ کلیہ تحریر کردیا ہے کہ کہاں "ی" لکھنی چاہیے اور کہاں "ہمزہ" لکھنا چاہیے، رقم طراز ہیں:

"...... جب بھی درمیان لفظ میں "ی" مفتوح ہوگی تو اس جگہ پر "ی" آئے گی "ہمزہ" نہیں آئے گا، جیسے مریل میں "ی" پر زبر (فتحہ) ہے، اگر اس کو (بالفرض) زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر اس کی "ی" "ہمزہ" سے بدل جائے گی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس وضع و انداز کے لفظوں میں، اگر مفتوح ہے تو وہ لازماً "ی" ہے اور اگر مکسور ہے تو "ہمزہ" ہے۔

اس کی ایک دل چسپ مثال لفظ گھائل ہے، قدما اس کو گھایل بھی سمجھتے تھے اور بادل، چھاگل وغیرہ کا ہم قافیہ کرتے تھے، بعد کو یہ لفظ زیادہ تر بالکسر استعمال ہونے لگا، جن لوگوں نے اس کو بالکسر استعمال کیا ہے انھوں نے اس کو گھائل لکھا اور سائل، قائل وغیرہ کے قافیہ میں لائے"۔ (اردو املا، ۴۳۴-۴۳۵)

مذکورہ قاعدے کے تحت عربی کے اسم فاعل کے الفاظ، مثلاً: قائل، سائل، شائق، قائم، دائم، صائم، لائق، فائق، تائب، نائب، صائب، غائب، دائر، سائر، طائر، حمائل، ضائع، شائع، فائز، جائز، متشائم، عائد، زائد، مطمئن وغیرہ کو رشید حسن خاں صاحب نے ہمزہ کے ساتھ لکھنے کی سفارش کی ہے۔

اس طرح عربی کی جمع مکسر میں بھی ہمزہ آئے گا، جیسے: مسائل، فضائل، شمائل، رسائل، وسائل، دلائل، قبائل، عجائب، غرائب، حقائق، شقائق، دقائق، کوائف، طوائف، وظائف، نظائر، بصائر، جزائر، دوائر، ذرائع، وقائع، صنائع، بدائع، شرائط، نتائج، جرائد، فوائد، عقائد، عمائد، قصائد، شدائد، نفائس، نقائص، فرائض، خزائن، قبائح، لوائح، قرائن، دفائن، ملائک، عزائم۔ (ایضاً، ص ۴۳۷-۴۳۸)

البتہ فارسی کے وہ مصادر جن کے امر کے آخر میں "ے" کا حرف آتا ہے، جیسے: آرائے، پیمائے، نمائے وغیرہ، چوں کہ ان کے آخر میں "ش" لاحق کرکے حاصل مصدر بنالیا جاتا ہے، اس لیے ایسے حاصل مصدر کو "ی" سے لکھا جائے گا، جیسے: آرایش، پیمایش اور نمایش وغیرہ۔

مذکورہ طور کے مصادر سے اسم فاعل بنانے کے لیے ان کے صیغۂ امر کے آخر میں "ندہ" بڑھایا جاتا ہے، جیسے آرائے سے آرایندہ اور نمائے سے نمایندہ، اس لیے ان مصادر کے

اسم فاعل بھی ''ی'' سے لکھے جائیں گے، اس طرح کے الفاظ کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

آرایش، آزمایش، افزایش، آسایش، آلایش، زیبایش، بخشایش، پیمایش، ستایش، فرمایش، کشایش، گنجایش، نمایش، شایستہ، آیندہ، پایندہ اور نمایندہ وغیرہ۔ (ایضاً ص ۴۲۸-۴۲۹)

میں نے علی گڑھ میں ایک بار پروفیسر نذیر احمد مدظلہ سے دریافت کیا تھا کہ مسائل، مصائب، قائم اور جائز جیسے الفاظ ''ی'' سے لکھے جائیں گے یا ''ہمزہ'' سے؟ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ فارسی والے تو ''ی'' سے لکھتے ہیں لیکن اردو میں ان کا املا ''ہمزہ'' سے ہونا چاہیے۔

نیاز فتح پوری کے ماہ نامہ ''نگار'' میں عربی کے مذکورہ وضع و انداز کے اسم فاعل اور جمع مکسر کے الفاظ چوں کہ ''ی'' سے لکھے گئے ہیں اور فارسی والے تو ''ی'' سے لکھتے ہی ہیں، اس لیے یہ ناچیز بھی ''ی'' سے لکھنے کا عادی ہوگیا تھا، ان شاء اللہ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔

مولانا اقبال سہیل کی نظم ''اقبال بنام اقبال'' ارسال کررہا ہوں، یہ نظم مدینہ بجنور میں بھی شایع ہوئی تھی اور مجلہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں بھی، علامہ اقبال کی نظم بہ عنوان ''حسین احمد'' تین اشعار پر مشتمل ہے، غور فرمائیں اقبال سہیل مرحوم نے علامہ اقبال ہی کی نظم کی بحر اور قافیہ و ردیف میں، قرآن و احادیث اور لغت عرب کو سامنے رکھ کر جس بالغ نظری سے نظم اقبال پر تنقید کی ہے، غیر منقسم ہندوستان کی فارسی شاعری میں شاید ہی اس کی نظیر مل سکے، میرے خیال میں فارسی میں اقبال سہیل کی اگر یہی ایک نظم ہوتی تو یہ ان کا بلند مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔

خط بہت طویل ہوگیا، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں:

لذیذ بود حکایت دراز گفتم

معارف کے اشاریے کے بارے میں نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کراچی سے چھپ کر آیا یا نہیں؟ آپ یا تو اس کا ایک نسخہ میرے لیے منگوا دیجیے یا اس کے پتا سے مطلع فرمائیے کہ میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے ذریعہ منگوا سکوں، جنوری کا معارف مل گیا ہے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

نیازمند

وارث ریاضی

مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات

۳/۲، دکاس کھنڈ

گومتی نگر، لکھنؤ، ۲۲۶۰۱۰۔

محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب

السلام علیکم، خدا کرے مزاج بخیر ہوں۔

ماہنامہ معارف جنوری ۲۰۰۶ء موصول ہوا، مضمون ''مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'' از پروفیسر ڈاکٹر ایم-ایس خان صاحب، پارک اسٹریٹ کلکتہ نظر سے گذرا، اس مضمون میں مولانا ابراہیم عمادی ندوی مرحوم کی کتاب ''مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات'' پر مضمون نگار نے روشنی ڈالی ہے، چنانچہ راقم نے اس ضمن میں مناسب جانا کہ اطلاعاً کچھ گوش گذار کردوں۔

حضرت مولانا مرحوم وطن فطن پور اعظم گڈہ میں ۱۶/اگست ۱۹۸۴ء گھر میں گر جانے سے صاحب فراش ہوئے اور کتاب پر نظر ثانی نہ کرسکے۔

کتاب مذکورہ ۱۹۸۵ء میں مرحوم کی وفات کے تین ماہ بعد دلی سے شایع ہوئی، راقم ملازمت کی مصروفیتوں میں الجھا رہا، حضرت مولانا مرحوم نے اپنی جملہ تحریریں اور باقیات راقم کے حوالے کرتے ہوئے انہیں استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی۔(۱)

چنانچہ کتاب ''مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات'' پر نظر ثانی کرنے کے بعد تصحیح شدہ کتاب مع اضافہ جات مکتبہ الحسنات کو برائے اشاعت روانہ کردیا ہے، امید ہے کہ جلد ہی یہ کتاب شایع ہوکر صاحبان علم کی دل چسپی کا باعث ہوگی۔

عرصہ سے آپ لکھنؤ تشریف نہیں لائے، ممکن ہے کہ آئے ہوں اور مجھے شرف ملاقات کا موقع نہ ملا ہو، مشتاق ہوں، سب کو سلام پیش ہے۔ والسلام

مخلص

شاہد عمادی

(۱) مکتوب نگار مصنف مرحوم کے لائق فرزند ہیں۔

وفیات

مولانا سید اسعد مدنیؒ

افسوس صد افسوس کہ ۶ رفروری کو مولانا اسعد مدنی نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی وفات قوم وملت کا بڑا خسارہ ہے۔

راقم نے انہیں کئی بار دیکھا اور اس حال میں دیکھا جب وہ صحت مند، توانا، تروتازہ، متحرک اور جوش عمل سے سرشار تھے لیکن ملاقات کا شرف دو تین بار ہی حاصل ہوا، مارچ ۱۹۸۸ء میں ان کے والد بزرگوار مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر مسجد عبدالنبی نئی دہلی میں سمینار ہوا تھا جس کے کنوینر ڈاکٹر رشید الوحیدی مرحوم تھے، اس میں پہلی بار ان سے شرف نیاز حاصل ہوا، بڑی بشاشت اور گرم جوشی سے ملے۔ آخری بار ۱۹۹۲ء میں سعودی سفارت خانے سے حج بیت اللہ کا ویزا لینے گیا تو دفعتاً ان پر نظر پڑی، لپک کر ملا، دریافت کرنے پر اپنے کو بتایا تو قریب کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور کچھ دیر تک باتیں کیں، غالباً بیماریوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس لیے مجھے بہت مضمحل اور بجھے بجھے سے نظر آئے۔

مولانا اسعد صاحب ۵ رنومبر ۲۰۰۵ء کو وہیل چیئر سے گر گئے، سر اور دماغ میں چوٹ آئی، عصر کی نماز کی تیاری کر رہے تھے کہ بے ہوش ہو گئے اور دہلی کے اپولو اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں تین ماہ تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ۶ رفروری کو ہزاروں لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار اور اشک بار چھوڑ کر رفیق اعلا سے جا ملے۔

اس وقت مسلمان بڑی ابتلا اور کشمکش کے دور سے گزر رہے ہیں، ملی قیادت کا میدان مولانا حفظ الرحمان مرحوم کے بعد ہی سے خالی چلا آرہا تھا، مولانا اسعد کی جرأت وبے باکی سے اس کی تلافی ایک حد تک ہوئی مگر ان کے اٹھ جانے سے پھر خلا ہو گیا اور مسلمانوں کی قومی بنیاد متزلزل ہو گئی۔

مولانا کے آباد اجداد کا اصل وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد تھا لیکن مولانا اسعد صاحب کی

پیدائش ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء کو دیوبند میں ہوئی، اعلا تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، فراغت کے بعد چند برس مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے، پھر دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ان کو قوم ووطن کی خدمت کا جذبہ وراثتاً ملا تھا، قدرت نے قیادت کی صلاحیتیں بھی بخشی تھیں، ۱۹۶۰ء میں جمعیۃ علمائے اترپردیش کے صدر مقرر ہوئے، یہ بڑا پرآشوب دور تھا، سرکاری درس گاہوں خصوصاً پرائمری اسکولوں میں مشرکانہ عقاید وتوہمات، ہندو میتھالوجی اور دیومالائی قصے کہانیاں نصاب تعلیم میں داخل کر دی گئی تھیں جن کو پڑھ کر مسلمان بچوں کا اپنے عقیدہ ومذہب پر قایم رہنا اور دین وایمان کو سلامت رکھنا ناممکن تھا، اس کے پیش نظر ۵۹-۱۹۶۰ء میں مرحوم قاضی عدیل عباسی نے بستی میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس میں مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے لوگ شامل تھے، اسی وقت دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا تھا، کانفرنس میں مولانا حفظ الرحمان ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند بھی شریک تھے لیکن ۱۹۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا، جمعیۃ کے زیر اہتمام ایک اور متوازی تحریک ''دینی تعلیمی بورڈ'' وجود میں آئی، دونوں تنظیموں سے بڑا فایدہ ہوا اور گاؤں گاؤں میں مکاتب قایم ہو گئے مگر بعد میں جمعیۃ کے تعلیمی بورڈ کی سرگرمیاں کم ہو گئیں لیکن الحمدللہ دینی تعلیمی کونسل اب بھی سرگرم عمل ہے اور مکاتب کے قیام کے علاوہ نصابی کتابوں کے زہر کا تریاق بھی بہم پہنچا رہی ہے۔

اترپردیش میں مولانا اسعد مدنی کی قوت عمل اور قائدانہ جوہر کو دیکھ کر ۱۹۶۳ء میں انہیں آل انڈیا جمعیۃ کا ناظم عمومی مقرر کیا گیا اور ۱۹۷۳ء میں وہ آل انڈیا جمعیۃ کے صدر منتخب کیے گئے اور وفات تک وہی صدر رہے، مولانا حبیب الرحمان اعظمی کے انتقال کے بعد وہ امیر الہند بھی بنائے گئے۔

مولانا حفظ الرحمان شروع سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوتے تھے، ان کے انتقال کے بعد جمعیۃ کا کوئی نمایندہ پارلیمنٹ کا ممبر نہیں رہ گیا تھا مولانا اسعد ۱۹۶۸ء میں پہلی بار راجیہ سبھا کے ممبر منتخب کیے گئے اور پھر وقفہ وقفہ سے تین بار ممبر چنے جاتے رہے، اس طرح ۱۸ برس تک وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے، اس عرصے میں ایوان کے اندر اور باہر بھی وہ بہت کھل کر کانگریس کی غلطیوں اور فرقہ وارانہ رویے کی مذمت کرتے تھے اور فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم مسائل پر بڑی

جرأت وہمت سے بے دھڑک آواز بلند کرتے تھے اور مسلمانوں کو باعزت مقام دینے اور ان کے جائز حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کرتے تھے، مرار جی ڈیسائی وزیر اعظم ہوئے تو مولانا نے ملک وملت بچاؤ تحریک شروع کی تھی۔

مولانا عرصے تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے، اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک کی جن تنظیموں اور اداروں سے ان کی وابستگی رہی، ان کے نام یہ ہیں:

راجیہ سبھا کی ضوابط کمیٹی۔ سرکاری یقین دہانی کمیٹی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ۔ شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔ مرکزی وقف کونسل۔ ہمدرد ٹرسٹ دہلی۔ مرکزی حج کمیٹی۔ مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ۔ موتمر اسلامی تیونیسیا۔ موتمر فقہی ریاض۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت وغیرہ۔

مولانا اسعد مدنی کو بہت سی خوبیاں اپنے والد ماجد سے موروثی طور پر ملی تھیں، تصوف و سلوک کے مراحل ان کی رہنمائی اور تربیت میں طے کیے تھے، ان ہی کی طرح ذکر، عبادت، ریاضت اور اوراد و وظائف کی پابندی کرتے اور اس میں کبھی ناغہ نہ کرتے، والد کی وفات کے بعد اس میدان میں ان کی جانشینی بھی کی اور بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا، گونا گوں مشغولیتوں کے باوجود ارادت مندوں اور مسترشدین کی تعلیم وتربیت میں کوتاہی نہ کرتے، مہمان نوازی، سخاوت اور فیاضی میں اپنے پدر بزرگوار ہی کی طرح حاتم طائی تھے، وہ روپے پیسے کو ہیچ سمجھتے تھے لیکن ان پر دولت کی بارش ہوتی تھی، ان کا کوئی کام پیسے کی وجہ سے نہیں رکتا تھا، ہر شخص کی ضرورتیں پوری کرتے، اس کے کام آتے اور مدد کرتے، کسی سائل کو محروم نہ کرتے، والد ہی کی طرح دسترخوان بہت وسیع تھا اور اس خوان یغما پر دوست اور دشمن کی تفریق نہ ہوتی، رمضان میں اعتکاف کے لیے لوگوں کا تانتا لگ جاتا، پہلے دیوبند کی مدنی مسجد میں پھر دارالعلوم کی رشید مسجد میں اعتکاف کرتے، معذوری کے زمانے میں بھی معتکف مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے بے چین رہتے، وہیل چیئر پر بیٹھ کر جائزہ لیتے اور ہر ایک کا خیال رکھتے، والد ہی کی طرح مہمانوں کے لیے ہمیشہ بچھے رہتے۔

وانی لعبد الضیف ما دام نازلا   وما شیمۃ لی غیرھا تشبہ العبدا

مولانا حسین احمد مدنی اپنی تمام تر مشغولیتوں کے باوجود بہ کثرت سفر کرتے، مولانا اسعد کی جولان گاہیں اس برصغیر ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ عرب، افریقہ اور یورپ کے ملکوں کا سفر بھی برابر کرتے رہتے اور ملک کا تو ایک ایک گوشہ ان کا چھانا ہوا تھا، ابھی ایک سفر سے واپس نہیں آتے کہ دوسرا شروع ہوجاتا تھا ع وما آب من سفر الا الی سفر۔

سال کے گیارہ مہینے سفر کے لیے وقف تھے مگر وہ جہاں بھی ہوتے رمضان سے قبل دیوبند پہنچ جاتے، شدید ضرورت بھی ہوتی تو رمضان میں سفر نہ کرتے۔

مولانا اسعد میں غیر معمولی قوت عمل اور خود ارادی تھی، وہ جس کام کو ٹھان لیتے اسے کر گزرتے، اس میں کوئی مشکل رکاوٹ نہیں بنتی تھی اور نہ سستی اور کاہلی ان کے قریب پھٹکتی تھی، نکتہ چینیوں کی پروا نہ کرتے، مصلحت واحتیاط بھی مانع نہ ہوتی، حماسی شاعر کے بقول

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ   ونکب عن ذکر العواقب جانبا

جمعیۃ علما کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو اسے متحرک اور فعال بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، قوم وملت کے مفاد کے لیے نئے نئے مشکل منصوبے بناتے اور بے خطر ان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتے، دوسرے لوگ حیص بیص میں سوچتے ہی رہ جاتے تھے، مولانا کی تیزی، سرعت اور قوت کار کا ساتھ دینا سب کے لیے آسان نہیں تھا، وہ سب کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے، غالباً اسی سے لوگوں کو شکایت ہوجاتی اور وہ اپنی نئی راہیں تلاش کرنے لگتے، ایسے مراحل ان کی زندگی میں کئی بار آئے، بہت سے آزمودہ، تجربہ کار اور منجھے ہوئے لوگ جن کی زندگیاں جمعیۃ اور دارالعلوم کی خدمت میں گزری تھیں کنارہ کش ہوجانے اور اپنی راہ الگ نکالنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

جمعیۃ مسلمانوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا اور ان کے تمام طبقے اس میں شریک تھے، اس کی تاریخ شاندار اور ماضی تابناک ہے، گو اس میں علمائے دیوبند کا غلبہ ہمیشہ سے رہا لیکن دوسرے طبقوں اور جماعتوں سے وہ کبھی خالی نہیں رہی، مگر آہستہ آہستہ وہ اس سے کنارے ہوتے گئے اور اب تو خود علمائے دیوبند بھی اس سے کنارہ کش ہوگئے ہیں اور اس کا دائرہ بہت محدود اور سمٹ گیا ہے۔

گو یہ سب مقدرات ہیں تاہم سب کو ساتھ لے کر چلنا وہ بھی دردمندوں اور مخلصوں کو

بڑی خوبی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اسعد بڑے متحرک، فعال اور عزم و خود ارادی کا پیکر تھے، وہ جب جمعیۃ علما کے قائد ہوئے تو اس کے صف اول کے اکثر قائدین وفات پا چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ اس سے الگ تھلگ ہو گئے تھے، ان حالات میں جب کہ آئے دن ملک میں فساد اور مسلمانوں کی جان و مال کا اتلاف ہو رہا تھا، اکیلے اپنی جان اور عواقب و نتائج کی پروا کیے بغیر ہولناک فرقہ واریت کے دہکتے شعلوں میں کود پڑنا اور فسادات اور قدرتی آفات میں لٹے پٹے، تباہ حال لوگوں کی مدد، راحت رسانی اور باز آباد کاری کے کاموں میں جٹ جانا وہ رتبہ بلند ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، یہی ان کے صاحب عزیمت اسلاف کا شیوہ تھا۔

اکیلے اور تنہا ہو کر بھی انہوں نے جمعیۃ علما کو اس کی خصوصیات کے ساتھ نہ صرف باقی رکھا بلکہ اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور محنت و جاں فشانی سے بعض حیثیتوں سے اسے ترقی بھی دی، ان سے پہلے جمعیۃ کا دفتر پرانی دہلی کی تنگ و تاریک گلی قاسم جان میں تھا، اسے وہ نئی دہلی کی مسجد عبدالنبی میں لائے اور دفتر کو اس عظمت رفتہ کی حامل جماعت کے شایان شان اور ویران مسجد کو آباد کر دیا، اس کے آس پاس کی زمینیں بھی دوڑ دھوپ اور سعی و محنت سے حاصل کر کے شان دار مدنی ہال، محمودیہ لائبریری اور دوسری عمارتیں تعمیر کرائیں اور ایک سنگلاخ وادی پر خار کو گل و ریحان سے آراستہ کر دیا۔

اسی طرح ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد دار العلوم کی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں اور ان کی بدولت بہت سے تعمیری و رفاہی کام انجام پائے جن میں وسیع و عریض مسجد رشید سب سے نمایاں ہے۔

مولانا اسعد نے بڑی مشغول اور مجاہدانہ زندگی گزاری، عقاید و شعائر اسلام کا تحفظ، خلق خدا کو فیض رسانی، دین و ملت اور قوم و ملک کی خدمت ان کا نصب العین تھا، وہ ملک میں مسلمانوں کو باعزت زندگی اور ان کے جائز حقوق دلانے کے لیے ہمیشہ سرگرم اور فکر مند رہے، اللہ تعالیٰ ان کی ان دینی و قومی خدمات کو قبول فرمائے اور بہشت بریں میں جگہ دے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین!

مولانا کی تدفین میں شرعی حکم کے مطابق بڑی تعجیل کی گئی پھر بھی ڈیڑھ لاکھ آدمی جنازے میں شریک ہوئے جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ۔

"ض"

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکتوب گرامی ملک عبدالعزیزؒ بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ

ملک عبدالعزیز کا یہ والا نامہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے ذخیرۂ مکتوبات میں محفوظ ہے، اس مکتوب سے مملکت سعودی عرب کے قیام کے ابتدائی زمانہ کی واقفیت ہوتی ہے، افادۂ عام کے پیش نظر اصل متن اور اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے، اردو ترجمہ مولوی محمد عارف عمری اعظمی نے کیا ہے۔ (معارف)

من عبد العزيز بن عبد الرحمن آل فيصل السعود الى حضرة الاخ المكرم السيد سليمان الندوى رئيس وفد جمعية الخلافة حفظه الله تعالى.

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ، وبعد فقد اخذنا بيد السرور كتابكم ووقفت على اسباب تأخركم فى جده بعد سماحنا لكم بالقدوم الينا و استعدادنا للمذاكرة والمباحثة فى كل ما اردتم ولكن ولاة الامور فى جدة منعوكم من السفر الا بشروط وضعوها لكم وهذا ليس بجديد فى تاريخ القوم فهم يودون لتأييد باطلهم بما يلفقونه من الافك والبهتان ولكن نور الحق يخترق حجب الباطل ويبين الصبح لذى عينين ، ان ما اظهرتموه فى كتابكم من الاسف على ما يقع وحبكم للسلم وميلكم الى التآخى والتصافى ليس بمستكبر على امثالكم ممن تمكن الايمان من قلوبهم واستنارت بصائرهم بنور الحق وانى اكثر منكم اسفاً وحزنا ولكن ما كل ما يتمنى المرء يدركه ، ان ما تعرفونه ويعرفه المسلمون فى ساير انحاء العالم مما اتاه الحسين وابنائه فى هذه البلاد الطاهرة لا يحتاج الى شرح وان ما قاساه العالم الاسلامى فى طغيان هذه العائلة وتحكمها فى حرم الله تعالى واستغلالها مركزها فى سبيل اغراضها الضارة مما لم يترك لنا مجالاً لحسن النية بهؤلاء القوم ، ان ما سننشره من الوثايق الرسمية على

العالم الاسلامی مما عثرنا علیه من اوراق القوم سیکشف حقائقهم ویظهر ما کانوا یکیدونه للاسلام والعرب وهی لم تزدنا الا استمساکا بالطریقة المثلی التی اختططناها لانفسنا من اول یوم اعلنا فیه الجهاد علی هؤلآء الاشرار ، اننا من اول یوم قمنا فیه بواجبنا اعلنا للملاء باننا لانقصد التوسع فی الملک ولا التسلط علی بلاد الله المقدسه ولا التحکم فی رقاب اهلها کما کان یفعله الحسین واولاده وانما قصدنا تأمین حرم الله وتسهیل الطرق لجمیع الوافدین و تطهیر اطهر بقعة فی الارض من ماد نسها به القوم من الاعمال التی تأباها الشریعة الطاهره ، اننا لا نرید الا الرجوع الی سیرة السلف الصالح فلا یصلح آخر هذه الامة الا ما اصلح اولها واننا سوف لا نجری الا علی المنهاج الذی یضعه العالم الاسلامی فلا غرض لنا فی هذه الحیاة الا باعلاء کلمة الله واظهار دینه ، واننا لا نحب سفک الدمآء ولا نمیل الی اثارة الفتن ولکن اولئک المتطوعین الذین جائوا الجهادنا علی زعمهم واتوا من بلادهم التی اغتصبها الاجنبی لتأیید الباطل واهله نری قتالهم واجبا علینا بل علی کل مسلم ابی وکل عربی لم یعمه الغرض ، اننا نری جهاد الحسین واولاده و شیعته من الآخذین باسباب الهوی الهادمین لارکان الدین المؤیدین للبدع الصارفین الناس عن سبیل الله نری جهادهم فرض عین لم نترکه فیما مضی الا لاسباب لا تخفی علی امثالکم اهل الفطنة والنظر الصائب واننا سنسیر فی طریقتنا معتمدین علی تأیید الله ومعونته وهو ولینا و نعم المولی ونعم النصیر هذا ما لزم تعریفه .

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته .

۱۳٤۳

۲ ب

بطیه العدد السادس والسابع من ام القری تطلعوا علیه وانتم بخیر .

عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل فیصل السعود کی جانب سے برادر مکرم سید سلیمان ندوی

قائد وفد جمعیۃ الخلافہ کے نام، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ، نہایت مسرت کے ساتھ آپ کے گرامی نامہ کو ملاحظہ کیا جس سے جدہ میں آپ حضرات کے دیر تک ٹھہرے رہنے کے اسباب سے واقفیت ہوئی، حالاں کہ ہماری طرف سے مکمل اجازت تھی کہ آپ حضرات تشریف لائیں اور ان تمام موضوعات پر تبادلۂ خیال کریں جو آپ کے پیش نظر ہیں، مگر جدہ کے کارپردازوں نے آپ حضرات کو سفر سے روک دیا اور اس کے لیے چند شرطیں مقرر کیں، اس قوم کی تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، یہ لوگ (شریف حسین اور اس کے خانوادہ کے لوگ مراد ہیں) اپنے غلط موقف کی تائید کے لیے کذب وبہتان تراشتے ہیں مگر نور حق باطل کے پردوں کو چاک کر دیتا ہے اور ہر بصارت والے شخص کے سامنے صبح روشن کو نمایاں کر دیتا ہے۔

اپنے مکتوب میں آپ نے موجودہ واقعات پر جو افسوس کا اظہار کیا ہے اور صلح کی آرزو اور مواخات وآشتی کی تمنا ظاہر کی ہے، وہ آپ جیسے لوگوں کے لائق شان ہے جن کے دل نور ایمان سے جگمگا رہے ہیں اور نگاہیں نور حق سے منور ہیں، واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ رنجیدہ وافسردہ ہوں لیکن انسان اپنی ہر آرزو کو حاصل نہیں کر سکتا، یقیناً آپ حضرات اور سارے عالم کے مسلمان اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ حسین اور اس کے بیٹوں نے اس مقدس سرزمین میں کیا کچھ نہیں کیا، عالم اسلام کو اس خانوادہ کے ظلم وتعدی اور حرم مکی کی بے حرمتی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس خاندان نے حرم کی تولیت کو اپنے مضر اغراض کے لیے جس طرح استعمال کیا ہے اس نے ان کے حق میں حسن ظن کی ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

عنقریب ہم سرکاری دستاویز عالم اسلام کے سامنے نشر کریں گے جو ہمارے ہاتھ لگے ہیں، جن سے ان کی حقیقت بے نقاب ہوگی اور اسلام اور عربوں کے خلاف ان کے مکر وفریب کا پردہ چاک ہوگا، اس چیز نے ہم کو اور زیادہ اپنے موقف پر مضبوط کر دیا جو ہم نے اول روز سے ان بدبختوں کے خلاف اعلان جہاد کی صورت میں اختیار کیا ہے، ہم ابتدا سے اپنے فریضہ کی انجام دہی پر قایم ہیں اور لوگوں کے سامنے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہمارا مقصد نہ تو ملکی توسیع پسندی ہے اور نہ ہی سرزمین مقدس پر غلبہ وتسلط اور وہاں کے باشندوں کو محکوم بنانا، جیسا کہ حسین اور اس کے بیٹوں کا طرز عمل رہا ہے، ہمارا مقصد وحید حرم مکی کو محفوظ بنانا اور تمام آنے والوں کے لیے

راستوں کو سہل بنانا اور اس روئے زمین کے مقدس ترین خطے کو ان نجس اعمال سے پاک کرنا ہے جن سے ان لوگوں نے اس کو آلودہ کر رکھا ہے اور یہ سب شریعت مطہرہ کے منافی اعمال ہیں۔

ہماری منشا صرف یہ ہے کہ سلف صالحین کے طریقہ کی پیروی کی جائے کیوں کہ اس امت کے بعد کے ادوار کی اصلاح اسی عمل میں مضمر ہے جو پہلوں نے اختیار کیا، ہم مستقبل میں محض اسی طریقہ پر گامزن رہیں گے جو عالم اسلام کی منشا کے مطابق ہوگا، اس دنیا کی زندگی میں بجز اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کے ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہے، ہم ہرگز خوں ریزی پسند نہیں کرتے اور نہ ہی فتنہ انگیزی کی طرف مائل ہیں، البتہ یہ پاکیزہ بننے والے لوگ جو اپنے زعم کے مطابق ہم سے جہاد کر رہے ہیں اور خود ایسے علاقوں سے آئے ہیں جن پر غیروں نے قبضہ کر رکھا ہے اور اس سے ان کا مقصد باطل اور باطل پرستوں کی نصرت وحمایت ہے، ایسے لوگوں سے ہم قتال کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ ہر غیرت مند مسلمان پر اور ہر عربی پر جو غرض کا باؤلا نہ ہو واجب سمجھتے ہیں، حسین اس کے بیٹے اور اس کے حمایتی جو نفسانیت کے شکار ہیں اور ارکان دین کو منہدم کرنے والے، بدعتوں کو فروغ دینے والے اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے والے ہیں، ایسے لوگوں سے جہاد کرنا ہم فرض عین سمجھتے ہیں۔

ماضی میں ہم نے بعض اسباب کی بنا پر جو آپ جیسے ذہین اور صائب نظر رکھنے والے لوگوں سے مخفی نہیں ہیں پہلوتہی کی لیکن ہم مستقبل میں اپنے طریقہ پر گامزن رہیں گے، اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے بھروسہ سے اور وہی بہترین مولیٰ اور بہترین مددگار ہے، یہ ضروری باتیں تھیں جن سے واقف کرانا ضروری تھا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

۲ / رب ۱۳۴۳ھ

اس خط کے ساتھ ام القریٰ، عدد ۶ - ۷ بھی آپ حضرات کے ملاحظہ کے لیے منسلک ہے، امید ہے کہ آپ لوگ بخیر ہوں گے۔

✿✿✿✿✿

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک غیر مطبوعہ خط

مجھے ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی (نومبر ۲۰۰۰ء) کے نام خطوط کا ایک ذخیرہ دست یاب ہوا ہے، اس میں ایک خط سید صاحب مرحوم ومغفور کا بھی ہے، یہ ابھی تک کہیں شایع نہیں ہوا ہے، اشاعت کے لیے معارف کو بھیج رہا ہوں۔

لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی واردو میں ہاشمی صاحب کے تقرر پر تہنیت کا یہ خط لکھا گیا تھا، یہ اعظم گڈھ سے ۱۷/ مارچ کو روانہ ہو کر ۲۰/ کو لکھنؤ پہنچا۔

مختارالدین احمد (علی گڑھ)

دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نمبر ۸۷ مورخہ ۱۶/ مارچ ۱۹۴۵ء

مکرمی! السلام علیکم

عنایت نامہ ملا جس سے خوش خبری کا علم ہوا، امید ہے کہ آپ اپنے سلسلۂ تحقیقات کو آیندہ بھی جاری رکھیں گے، اس بجا تقرر پر یونی ورسٹی کو مبارک باد دینا چاہیے، اتنی اور دعا ہے کہ لکھنؤ یونی ورسٹی کی فاسد آب وہوا سے آپ محفوظ رہیں۔

میں ابھی ۹/ مارچ سے ۱۳/ مارچ تک لکھنؤ ہی میں تھا، ان شاء اللہ آیندہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ والسلام

سید سلیمان

✿✿✿✿✿

مطبوعات جدیدہ

ذکر زکریاؒ: مرتب جناب مولانا فیروز اختر ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۸۲، قیمت درج نہیں، پتہ: جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ، مکتبہ ندویہ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ و مکتبہ الفرقان، لکھنؤ وغیرہ۔

یادگار سلف اور عصر حاضر کے مشہور محدث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی ذات گرامی کے متعلق یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ وہ ائمہ سلف صالحین کے سلسلہ زریں کی عہد ساز کڑی تھے، ان کی علمی خدمات کا دائرہ قرآن، فقہ، تاریخ، ادب کو محیط ہے لیکن بے شبہ علم حدیث کی خدمت ان کی جامع زندگی کا سرعنوان بن گئی، الکوکب الدری، لامع الدراری، اوجز المسالک اور بذل المجھود اور الفیض السمائی جیسی مولفات اور علم حدیث کی تدریس کے تاعمر اشتغال نے ان کے لیے شیخ الحدیث کے لقب کو علم بنا دیا، ان کی حیات و خدمات پر ان کی زندگی میں اور بعد میں بھی علما نے داد تحقیق دی لیکن ایک نہایت جامع و کامل شخصیت کی جلوہ سامانیوں کو سمیٹنے کے لیے یہ کوششیں ناکافی تھیں، حضرت شیخ الحدیث کے تلمیذ رشید اور لایق فخر شاگرد و مسترشد مولانا تقی الدین مظاہری ندوی نے اسی احساس کے تحت اپنے ادارے جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں ۲۰۰۴ء میں ایک نہایت شاندار مذاکرہ علمی کا انعقاد کیا جس میں علما و محققین کی کثیر تعداد شامل ہوئی اور حضرت شیخ کی حیات، علمی و دینی و ادبی خدمات اور خاص طور پر ان کی تصنیفات و تالیفات پر بہترین اور بلند پایہ مقالات پیش کیے گئے، حضرت شیخ پر مضامین و مقالات کا یہ تنوع اس لایق تھا کہ اس کو کتابی شکل میں مرتب کیا جاتا، زیرنظر کتاب اسی خواہش کا ثمرہ ہے اور ترتیب کے حسن سلیقہ کے ساتھ ہے، ابتدائیہ کے تحت سمینار کے خطبات استقبالیہ و صدارت اور روداد وغیرہ یکجا ہیں اور پھر مختلف ابواب میں حضرت شیخ کے دینی و علمی کارناموں کی تقسیم ہے، قدرتاً تصنیفات کا باب زیادہ اہم ہے کہ اس میں مشاہیر اہل قلم کے ذریعہ حضرت شیخ کی مختلف کتابوں پر سیر حاصل مطالعہ و تبصرہ آگیا ہے، خصوصاً حضرت شیخ کے طریق تشریح و تعلیق کا جایزہ قابل ذکر ہے، مثلاً مفتی ابوالقاسم نعمانی کی رائے ہے کہ مولانا گنگوہیؒ کسی حدیث پر کلام فرماتے

ہوئے عموماً مختلف اقوال میں صرف راجح قول بیان کرتے ہیں جب کہ حضرت شیخ اس رائے کی ترجیح و توثیق کے ساتھ دوسرے آرا کی جانب بھی اشارہ فرمادیتے ہیں یا حضرت گنگوہی کی تقریر درس میں کوئی لفظ یا مختصر جملہ ایراد دفع کے طور پر ہے، حضرت شیخ اشکال و جواب کی مکمل تقریر فرماتے ہیں، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے لکھا کہ روایات مختلفہ اور مختلف فیہ امور میں حضرت شیخ نے حتی الامکان جمع و تطبیق یا تاویل و توجیہ کی راہ اختیار کی یا پھر پوری تحقیق اور دلیل سے اپنی ترجیح و تصویب کا ذکر کیا لیکن پروفیسر یاسین مظہر صدیقی کی رائے یہ ہے کہ حضرت شیخ ان نابغہ روزگار شارحین حدیث میں ہیں جن کی درایتی تنقید کے نمونے ملتے ہیں، وہ متصادم روایات کو جمع تو کردیتے ہیں مگر ان پر محاکمہ نہیں کرتے، ان کی اس رائے کی تردید مذکورہ مضامین سے ہوتی نظر آتی ہے، کتاب جامعہ اسلامیہ کے مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی کی جانب سے شایع ہوئی ہے اور یہ یقیناً اس مرکز کے لیے قابل فخر ہے۔

یادگار نامہ یوسف حسین خاں: مرتبین پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی اور جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

قایم گنج فرخ آباد کے مشہور خانوادۂ خاناں کے فخر خاندان تو بے شبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے لیکن ان کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں علمی و ادبی اور تعلیمی سربلندیوں میں کچھ کم نہیں، جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تاریخ کے استاد، مسلم یونی ورسٹی کے پرووائس چانسلر، فکر و نظر کے اڈیٹر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے روشن نقوش ثبت کیے، غالب و اقبال کے ماہرین اولین میں ان کا شمار ہوا، اردو غزل اور خودنوشت یادوں کی دنیا ان کی بلند پایہ کتابیں ہیں اور ان کو شایع کرنے کا فخر دارالمصنفین کو حاصل ہوا، ان کی اپنی اور علمی و ادبی شخصیت کا مطالعہ دل چسپ اور مفید ہوسکتا ہے، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں کی مرتبہ شناسی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے ایک قابل قدر شخصیت کی یادوں کو زندہ کیا اور ایک بہترین مجموعہ مضامین ان کی شان میں نذر کیا، یوسف صاحب کے متعلق خود ان کی خودنوشت سے ماخوذ تحریر کے علاوہ

ان کے برادر زادہ پروفیسر مسعود حسین خاں کے قلم سے ایک دل چسپ مضمون ہے جس میں انہوں نے لکھا کہ یوسف صاحب کے اقدار عالیہ کا سرچشمہ بلاشبہ اسلام اور قرآن تھا، تعقل اور اعتدال پسند ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر وہ اکثریت کے جانب دارانہ رویہ پر ترش رو بھی ہوتے اور تلخ دہن بھی، ان دو تحریروں کے بعد، غالب، ادب فارسی، تاریخ قرون وسطی پر چند اہم مضامین ہیں، پروفیسر سید امیر حسن عابدی کا مضمون جون پور کے ایک کم نام لیکن صاحب کمال شاعر غالب جون پوری کے متعلق ہے، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر نذیر احمد اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی وغیرہ بلند پایہ اہل قلم کی کاوشوں کا یہ مجموعہ واقعی یادگار نامہ ہے۔

قرآنیات کے چند اہم مباحث: از ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، صفحات ۲۶۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

مولانا فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، ڈپٹی نذیر احمد کی بعض قرآنی تشریحات اور تفسیر کے باب میں ان کے منہج و طریق کی توضیحات پر مشتمل دس مضامین کا یہ مجموعہ علوم قرآنی کے طالبین کے مطالعہ کے لیے عمدہ تحفہ ہے، مولف کو مدرسۃ الاصلاح کے تعلق اور خود ان کے ذوق کی سلامتی کی وجہ سے قرآنیات سے خاص شغف ہے، مولانا فراہی کے نظم قرآن کے فہم کی تفہیم آسان نہیں، ان کی اسی موضوع پر کتاب مفردات القرآن کے مشمولات بھی اس ضمن میں ہیں، اس کتاب کا پہلا مضمون اسی کے حوالے سے ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس کے مطالب آسان بنادیے جائیں لیکن بعض جگہ اب بھی ابہام ہے، مثلاً یہ عبارت کہ "قرآن کریم میں کتاب احکام کے لیے آیا ہے اور حکمت اصول احکام کے لیے، کتاب اور حکمت کے سلسلے میں بعض اہل علم اور نبی کی اتباع میں امام شافعی نیز اکثر محدثین کرام کو تسامح ہوگیا ہے کہ الکتاب سے کتاب اللہ مراد ہے، یہ کہنا بھی کچھ عجب سا ہے کہ "یہ بالکل طے شدہ ہے کہ حکمت سے کچھ اور مراد ہے"، آیت ولما جاء عیسی بالبینات الخ کی روشنی میں یہ کہنا بھی محل نظر ہے کہ "اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حکمت کو حدیث سے تعبیر کرنا درست نہیں، ان الحکم الا للہ کا ترجمہ "اختیار و اقتدار صرف اللہ کا ہے" بھی غور طلب ہے، لفظ الشوری کے متعلق لکھا کہ "اس کے معنی میں بڑے اختلافات

ہیں" لیکن سوائے ایک مفہوم کے اور معانی کی جانب اشارہ نہیں، شکر کے متعلق اس تحریر میں ژولیدگی ہے کہ "یہ دائمی کیفیت کا نام ہے کیوں کہ نعمتیں دائمی ہیں اور جو صرف شدائد کے وقت ہوتا ہے" مولانا کی تفسیر سورہ والتین کا مطالعہ بھی ہے اور بہت جامع ہے، مطالب القرآن کے بارے میں لکھا گیا کہ "چند جگہوں کے برعکس یہ کتاب ہرگز قابل اعتراض نہیں" برعکس شاید باوجود کے معنی میں استعمال کیا گیا، مولانا ابواللیث اصلاحی کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ ان کے مقالات میں فکر فراہی کا عمیق عنصر شامل ہے، مجموعی لحاظ سے فاضل مولف کی یہ تحریریں مطالعہ علوم قرآنی کی اچھی مثال ہیں، انہوں نے اس کو حقیر کاوش سے تعبیر کیا ہے، درحقیقت یہ قابل قدر کاوش ہے۔

البلاغۃ القرآنیہ: از جناب مولوی اخلاق احمد کریمی، مولوی محمد حسن ندوی اور مولوی برکت اللہ قاسمی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: اتحاد بک ڈپو، دیوبند، ضلع سہارن پور۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اس کے ہمہ گیر اعجاز کا ایک پہلو ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دور اول سے اب تک زبان و ادب کے ماہرین اس کے بحر بلاغت کی غواصی میں مصروف اور عجائبات لغت کی یافت میں کامیاب ہوتے رہے، قرآنی بلاغت کے اسرار و غوامض سے بہرہ مند ہونے کے لیے کتابیں بھی بہ طور کلید معرفت مسلسل مرتب کی جاتی رہیں، مدارس کے نصاب میں البلاغۃ الواضحہ، دروس البلاغہ جیسی کتابیں معروف ہیں لیکن خوب سے خوب تر کی گنجایش ہمیشہ رہتی ہے، یہ کتاب بھی اسی گنجایش کی تلاش کا نتیجہ ہے، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ عربی مضامین کے ساتھ اس میں فنی اعتبار سے اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے، مثلاً فصاحت کی عربی تعریف کے ساتھ عربی مثال بھی ہے، اردو میں اس عربی تعریف کے ترجمے کے علاوہ اردو کی مناسبت سے تعریف مزید اور اردو اشعار کے ذریعہ مثال بھی پیش کی گئی ہے، اس کوشش نے کتاب کو اردو داں طلبہ کے لیے مفید تر بنادیا ہے، اشعار کے انتخاب میں لائق مرتبین کا حسن ذوق نمایاں ہے، البتہ ترجمہ اور سہل و رواں ہوسکتا تھا جیسے تعقید معنوی کی یہ تعریف کہ "وہ یہ ہے کہ کلام کا مطلب متکلم کے مطلب تک لوازم بعیدہ اور وسائط کثیرہ کے بغیر ظاہر نہ ہو"، "امر وہ فعل ہے جس میں علی وجہ الاستعلاء طلب کے معنی پائے جائیں" وغیرہ، تاہم مرتبین کی یہ لائق تحسین کاوش مدارس و جامعات عربیہ کے نصاب

میں طلبہ کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

حصار زدہ مسلم یونی ورسٹی اور محمود الرحمن کا ویژن: از جناب احمد علی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

مسلم یونی ورسٹی آج کل اپنے اقلیتی وجود اور کردار کے اعتراف و اقرار کے لیے نبرد آزما ہے، یہ کتاب اس مشق ستم سے پہلے کی ہے لیکن اس کا ربط موجودہ بحرانی دور سے بہ آسانی قائم کیا جاسکتا ہے، جناب محمود الرحمن کی وائس چانسلری کا دور کئی حیثیتوں سے اہم رہا، ان کے دور میں یونی ورسٹی کی کارگزاریوں کا جائزہ آسان نہیں بلکہ شاید پرخطر کاوش ہو، خود جناب محمود الرحمن کا کہنا ہے کہ "علی گڑھ تحریک کی کثیر المقاصد سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ فعال سے زیادہ ساکت وجامد ہے"، زیر نظر کتاب میں یونی ورسٹی کے حصار میں رہنے والے کے قلم سے مسلم یونی ورسٹی کے مسائل اور ان کے سدباب کا اظہار ہے اور یہ ڈاکٹر محمود الرحمن کے دور اور وائس چانسلروں کی تقرری جیسے گوشوں سے ظاہر ہے زیادہ اہم ہے، عدالتوں کے موجودہ احکام کے اجرا سے پہلے اس کتاب میں یہ احساس ظاہر کیا گیا تھا کہ ۱۹۸۱ء کے پارلیمانی ایکٹ کے ذریعہ دی گئی مراعات کے معاملات گنجلک ہیں، اقلیتی کردار کے نام کے باوجود اس سے یونی ورسٹی کا دائرہ اختیار محدود کردیا گیا ہے، یونی ورسٹی کے نظام کو چلانے والی باڈیز کا دائرہ عمل اور طریقہ کار بھی سنجیدہ اور پیچیدہ سوالات سے خالی نہیں، لائق مصنف کی اس تالیف کا مقصد تو یہی ہے کہ "تعلیمی سہولتوں اور کارکردگی کے تضاد کے اسباب وعلل تلاش کیے جائیں کہ مروجہ نظام نامکمل وناکافی ہے، وائس چانسلر کا طریقہ انتخاب نامناسب اور حکومت کا حد درجہ عمل دخل نازیبا اور کچھ اختیاراتی ادارہ کا رول باعث تشویش ہے"، یہ پوری کتاب ایسے ہی مسائل پر محیط ہے، حصار زدہ عنوان سے بھی لغوی اظہار مراد نہیں بلکہ وہ باتیں اور واقعات ہیں جنہوں نے اس کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ موضوع اور مقصد کی اور واضح شکل بعد کے صفحات میں نظر نہیں آتی اور یہ صرف ڈاکٹر محمود الرحمن کی مساعی کی داستان بن کررہ جاتی ہے، یہ ضرور ہے کہ جن مسائل کا ذکر ہے وہ ہیں بہت اہم اور قابل توجہ، اس لحاظ سے موجودہ حالات میں اس کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ع-ص